۱۹۵۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

جلد ۱۱۹ | جنوری ۱۹۹۳ء | عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل - ۵۳۴۰

جلد ۱۱۹ عدد ۱

جنوری ۱۹۹۳ء رجب المرجب ۱۴۱۳ھ

فہرست مضامین

برائے اداراتی امور: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰ — فون نمبر ۸-۴۷۱۲۴، ۲۸۱۴۷ فیکس (۰۴۲) ۷۸۴۷۱۹

برائے انتظامی امور: رحمٰن مارکیٹ ۱۰ اردو بازار، لاہور ۵۴۰۰۰ فون نمبر: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵

پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ: ۵ روپے زرِ سالانہ: ۶۰ روپے (اندرونِ ملک)

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر 'ترجمان القرآن' اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرّم مراد

بابری مسجد کی شہادت کے المناک حادثہ پر ہر مسلمان کا دل سوگوار ہے' اور اس کا وجود سراپا احتجاج۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بھارت کے ہندو جنونیوں نے ۱۵۲۶ میں ظہیرالدین بابر کے دور میں تعمیر کردہ اس تاریخی مسجد کو مسمار کردیا۔ یہ وہ ہندو جنونی ہیں جو مسلمانوں کو الٹی میٹم دے چکے ہیں کہ بھارت میں رہنا ہو تو ہندو بن کر رہو' ورنہ ملک چھوڑ کر چلے جاؤ۔ یہ بھارت کو ایک ایسا ملک بنانے پر تلے ہوئے ہیں جہاں بسنے اور جینے کا حق صرف ہندوؤں کو حاصل ہو۔ بابری مسجد کے انہدام نے ان کے عزائم کی تکمیل کا دروازہ کھول دیا ہے۔ ان کو اپنی حکومتوں کی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ بابری مسجد کا حادثہ یوپی کی صوبائی حکومت کی عملاً شرکت' مرکزی حکومت کی عمداً چشم پوشی' اور عدالتوں کی طرف سے التوا و تاخیر کی روش کے بغیر وقوع پذیر ہونا ممکن نہ تھا۔

بابری مسجد ڈھانے کے بعد' ان ہندوؤں کے پاس اور ہزاروں مساجد کی فہرست ہے جن کو مسمار کرکے یہ مندر تعمیر کرنے کا منصوبہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ' بقول ان کے' یہ مساجد' مندر منہدم کرکے تعمیر کی گئی تھیں۔ یوپی اور سی پی میں بھارتی جنتا پارٹی کی حکومتوں نے حکومتی اقدامات کے ذریعے مسلمانوں کی تعلیم' معاشرت اور ثقافت کو ہندو مت کے رنگ میں رنگنے کی ایک منظم مہم شروع کرر کھی ہے۔ مسلمانوں کو خوف و طمع کے ذریعہ ہندو بنانے کی سرگرمیاں بھی زور و شور سے جاری ہیں۔ ان پر تعلیم' ذرائع معاش' ملازمتوں اور تجارت کے دروازے تقریباً بند ہیں۔ ان کو دوسرے نہیں بلکہ تیسرے درجے کا شہری بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے خون سے روز ہی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت پر احتجاج ہی کی سزا میں ہزاروں مسلمان شہید کیے جاچکے ہیں' ٹرینوں سے گھسیٹ گھسیٹ کر مسلمانوں کو ذبح کیا گیا ہے' محلے کے محلے جل رہے

ہیں۔

بابری مسجد کی شہادت نے بھارتی سیکولرازم کی مسلم دشمنی کے بھیانک چہرہ کو بالکل بے نقاب کردیا ہے۔ وہ مسلمان حکمران جنہیں ہمیشہ مسلمان بھائیوں کے مقابلہ میں ہندو بھارت زیادہ عزیز رہا ہے' اگر اب بھی اپنی بھارت نوازی کی روش پر گامزن رہیں تو ان کی بے حسی اور بے شرمی پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہو گا۔ مغرب کے ان دانشوروں اور سیاستدانوں کی آنکھیں بھی کھل جانا چاہئیں جو ہمیشہ ہندو مت' گاندھی اور اہنسا کے گُن گاتے رہتے ہیں' جنھوں نے کبھی پاکستان کو قبول نہیں کیا ہے' اور جن کو صرف مسلمان ہی جنونی و متشدد مذہبیت کا علم بردار نظر آتا ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ بابری مسجد بہرحال اینٹ پتھر کی ایک عمارت ہی تو تھی۔ اسی ایک مسجد پر اتنا واویلا کیوں؟ مشرقی پنجاب میں سیکڑوں مساجد ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں ہیں' بوسنیا میں ۶۵۰ مساجد مسمار یا تباہ کی جاچکی ہیں' اسپین اور سسلی سے مساجد کا نام و نشان مٹایا جاچکا ہے' مسجدِ قرطبہ جیسی مسجد میں بھی نماز پڑھنا ایک جرم ہے! لیکن بات یہ ہے کہ بابری مسجد کا انہدام صرف ایک مسجد کا انہدام نہیں' یہ اسپین' سسلی' مشرقی پنجاب اور کشمیر کی طرح ہندوستان میں مسلمانوں کے آثار' نام و نشان' تہذیب و ثقافت اور دین و ایمان کو مٹانے کے عمل کا آغاز ہے۔ اگر امتِ مسلمہ اور عالمی رائے عامہ نے اس اقدام کی بھرپور مزاحمت نہ کی' اور بھارت کو مجبور نہ کیا کہ وہ بابری مسجد کو اسی شکل میں اور انہی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کرے' تو پھر جنونی اور فرقہ پسند ہندوؤں کو مسلمانوں کے مکمل استیصال کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے سے روکنا محال ہوجائے گا۔

اس مقصد کے لیے نہ مذمتی بیان کافی ہیں' نہ آنسو بہانے سے کچھ حاصل ہے۔ نہ اقوامِ متحدہ میں یہ مسئلہ اٹھانے سے کوئی نتیجہ برآمد ہوگا۔ اقوامِ متحدہ تو عراق کی فوجی طاقت تباہ کرنے کے لیے کارروائی کرسکتی ہے' سوڈان کو سرزنش کرنے کے لیے صومالیہ میں فوجیں اتار سکتی ہے' لیکن فلسطین' کشمیر' بوسنیا' ہندوستان میں مسلمانوں کے کشت و خون اور بابری مسجد جیسے مسائل سے اسے کیا دلچسپی۔ بے اختیار عوام تو صرف آنسو بہا سکتے تھے' احتجاج کرسکتے تھے' جلوس نکال سکتے تھے' نعرے لگاسکتے تھے۔ مگر جو بااختیار ہیں' صاحبِ اقتدار ہیں' ان کو ٹھوس' عملی اور مؤثر اقدامات اٹھانا چاہئیں۔ الّا یہ کہ ان کی نیت اس مسئلہ کو بھی گردشِ زمانہ کی نذر کردینا ہو' اور انھیں یہ مسئلہ "سیاسی" نہیں بلکہ "مذہبی" نظر آتا ہو' اور مذہبی مسئلہ پر کسی کارروائی سے ان کو اپنی مادی و معاشی ترجیحات خطرہ میں پڑتی نظر آتی ہوں' یا بین الاقوامی چڑیا گھر میں شور و غوغا سے

ڈر لگتا ہو۔

اس سلسلے میں سب سے بڑھ کر ذمہ داری پاکستان کے حکمرانوں' پر' اور سارے پاکستانیوں پر' عائد ہوتی ہے۔ پاکستانی قوم تو خبر سنتے ہی سراپا احتجاج بن گئی۔ وزیراعظم کے اعلان سے پہلے ہی' اگلے ہی دن' ملک بھر میں کاروبارِ زندگی تھم گیا' سڑکیں جلوسوں سے بھر گئیں' فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ قوم اس کے علاوہ اور کیا کرسکتی تھی۔ لیکن ہمیں بڑے درد اور تأسف سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ جناب وزیراعظم اور ان کی حکومت ملتِ اسلامیہ کے مفاد کے تقاضوں اور قوم کی توقعات کو پورا کرنے میں بالکل ناکام رہی ہے۔ آج یہ سطور لکھنے تک اس سانحہ کو تقریباً ایک ہفتہ ہوچکا ہے' مگر ان کی طرف سے ایک بھی عملی اقدام نہیں کیا گیا ہے جو کسی درجہ میں بھی بھارت پر دباؤ ڈالنے' یا امتِ مسلمہ کو انگیخت کرنے' یا بین الاقوامی رائے عامہ کو ہموار کرنے میں کامیاب ہوسکتا۔ ان کی طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس نے بھی' جو انھی کی بے تدبیریوں کی وجہ سے نہ "آل پارٹیز" بن سکی نہ کسی درجہ میں بھی حکومت کے علاوہ بقیہ قوم کی نمائندہ' ایک ایسا اعلامیہ جاری کرنے کے علاوہ کچھ نہ کیا' جس کو دیکھ کر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اگر اقتدار سے باہر چند جماعتیں بھی مل بیٹھتیں تو ایسا صرف مذمت' جذبات اور نیک خواہشات پر مشتمل اعلامیہ وہ بھی جاری کرسکتی تھیں۔ یہ کانفرنس وزیراعظم پاکستان نے بلائی تھی' پوری حکومت اس میں شریک تھی' پھر کیا اس کے بطن سے یہی خالی خولی الفاظ کا مجموعہ برآمد ہونا تھا۔

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند۔ لیکن ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ان کی نظر میں سفارتی تعلقات منقطع کرنا اس حادثہ کی سنگینی کے باوجود ایک انتہاپسندانہ اقدام تھا' تب بھی اس اقدام میں کیا امر مانع تھا کہ دہلی میں پاکستانی سفیر کو فوراً واپس بلا لیا جاتا' عارضی مدت کے لیے صلاح مشورے کے نام ہی سے سہی؟ کیا نقصان ہوجاتا اگر تجارتی تعلقات (اگر منقطع نہیں تو) معطل کر دیے جاتے' اور پاکستانی بازاروں سے بھارتی مال اٹھوا دیا جاتا؟ کیا خطرہ لاحق ہوجاتا اگر کراچی میں بھارتی قونصل خانہ بند کردیا جاتا' جب کہ یہ حادثہ نہ ہوتا تب بھی بھارت بمبئی میں پاکستانی قونصل خانے کی اجازت نہ دے کر اس اقدام کے لیے مکمل قانونی اور سفارتی جواز فراہم کرچکا تھا؟ کیا رکاوٹ تھی کہ اسلامی ممالک کی تنظیم کے وزرائے خارجہ کا فوری اجلاس طلب کرلیا جاتا؟ کیا زحمت اٹھانا پڑتی کہ' اگر وزیراعظم خود نہ جاسکتے' تو فوراً اعلیٰ سطحی وفود پوری دنیا میں' اور خصوصاً مسلمان ممالک کی طرف' روانہ کردیتے تاکہ وہ امتِ مسلمہ اور بین الاقوامی رائے عامہ کو ہموار کرنے کا کام کرتے؟ کیا ہمارے سفارت خانوں ہی کو کوئی فوری ہدایات جاری کی گئیں؟

کیا ان کو بابری مسجد کیس کے بارے میں سارے ضروری حقائق اور معلومات فراہم کی گئیں؟ یہ اور ایسے بہت سارے سوالات ہیں جن کا جواب حکومت کے ذمے ہے۔ ہم یہ حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ ملک کی ساری قابلِ ذکر جماعتیں بابری مسجد کے معاملہ پر کم و بیش ایک ہی قسم کے جذبات رکھتی ہیں۔ اگر ان سب کا وزیرِ اعظم کی دعوت پر مل بیٹھنا اور ایک متفقہ لائحہ عمل تیار کرنا دشوار یا مشکل ہو رہا ہے' تو متذکرہ بالا اقدامات کا مطالبہ تو پاکستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ عوام کے اس متفقہ لائحہ عمل کے کسی ایک ہی جز کو بھی عملی جامہ پہنانا کیوں مشکل یا ناممکن ہو گیا ہے۔

اگر ملک کی ساری جماعتیں بابری مسجد کے معاملہ پر مل کر نہیں بیٹھ سکی ہیں تو اس کی واضح وجوہات ہیں۔ اور اس ضمن میں جناب وزیرِاعظم اور اپوزیشن دونوں کی خدمت میں چند گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ملک کے وزیرِ اعظم کو کسی ایک پارٹی کا لیڈر اور صرف اپنی حکومت کا سربراہ ہی نہیں ہونا چاہیے' اس کو قوم کا لیڈر بھی ہونا چاہیے۔ ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے اس کا سب سے بڑھ کر یہ فرض ہے کہ وہ مختلف جماعتوں' طبقات' اور نقطہ ہائے نظر کے درمیان تنازع اور محاذ آرائی کو کم سے کم کرے' ان کے درمیان اتفاق و توافق اور یک جہتی کو زیادہ سے زیادہ بڑھائے' تلخیوں کا زہر گھولنے کی بجائے تلخیاں کم کرنے کی اور محبت و تعاون میں اضافہ کرنے کی کوشش کرے۔ قومی نوعیت کے مسائل میں ذات' پارٹی' اور حکومت سے بالا تر ہو کر لوگوں کو متفق و متحد کر کے ایک آواز اور ایک موقف کا حامی بنائے۔ بابری مسجد کے مسئلہ کی حد تک محض آل پارٹیز کانفرنس کا کر لینا فی نفسہٖ کوئی ہدف اور مقصد نہ تھا۔ ہدف اور مقصد تو زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے پیدا کرنا ہونا چاہیے تھا' کہ قوم کے یک زبان ہونے ہی سے بابری مسجد کے مقصد کو تقویت پہنچ سکتی تھی۔

حکومت نے ایک آل پارٹیز کانفرنس تو کر لی' لیکن حکومت میں شامل پارٹیوں کے علاوہ اس کانفرنس میں کسی اور پارٹی کو شریک نہ کر سکی۔ ادھر جس وقت اسلام آباد میں حکومت کی طلب کردہ کانفرنس ہو رہی تھی' ٹھیک اسی وقت لاہور میں اپوزیشن کی تقریباً" تمام بڑی بڑی پارٹیوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ یہ بدنما صورتِ حال کیوں پیدا ہوئی؟ اس کے لیے سب سے پہلے جناب وزیرِاعظم اور ان کے شرکائے حکومت کو ذمہ داری قبول کرنا چاہیے۔

انہوں نے اپنی کانفرنس ٹھیک اسی دن اور اسی وقت رکھ دی جس دن اور جس وقت' بقول اپوزیشن' وہ بھی اپنی کانفرنس رکھ چکی تھی۔ شواہد' بظاہر اپوزیشن کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ کیا وہ اپنی کانفرنس دو دن بعد نہ رکھ سکتے تھے؟ اگر اپوزیشن کا یہ الزام درست نہ بھی ہو' اور جناب وزیرِاعظم نے اپنی کانفرنس پہلے ہی بلائی ہو' تب بھی کیا وہ کسروانکسار کرکے اپنی کانفرنس دو دن مؤخر نہ کر سکتے تھے؟ اس طرح اپوزیشن کا یہ عذر ختم ہو جاتا کہ اس کے لیے شرکت ممکن نہیں' یا یہ کہ اس کو غوروخوض کا وقت نہیں ملا۔ اور اگر وہ ' بقول وزیرِاعظم' اگر بابری مسجد پر اپنی سیاست چمکانے کی فکر میں تھی' تو اس طرح اس کے عزائم پبلک کے سامنے عیاں ہو جاتے۔ ہرصورت میں وزیرِاعظم کی اخلاقی اور سیاسی پوزیشن مضبوط ہوتی۔ تواضع اور کسروانکسار سے ان کو بھی فائدہ ہوتا' بابری مسجد کے مقصد کو بھی تقویت پہنچتی۔ جو درخت جھکنا جانتے ہیں' وہی ثمربار ہوسکتے ہیں' جو اکڑے کھڑے رہتے ہیں' وہ بے ثمر رہتے ہیں۔

دوسرے ان کو کانفرنس کا اعلان کرنے سے پہلے ہی سب جماعتوں کے قائدین سے ذاتی طور پر ربط قائم کرنا چاہیے تھا' ان کو قائل اور راضی کرنا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس اعلان کے تقریباً" ۲۴ گھنٹے بعد' اور کانفرنس سے چند گھنٹے پہلے' ان کے وزراء نے دوڑ دوڑ کر دعوت نامے پہنچانا شروع کیے' یا انھوں نے خود فون کیے۔ ۹ دسمبر کی شام تک اکثر لوگ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ ہم کو تو اب تک پتہ ہی نہیں چلا کہ ایسی کوئی کانفرنس ہو رہی ہے۔

تیسرے ان کو ہوم ورک کرکے یہ طے کرنا چاہیے تھا کہ حکومت کیا عملی اقدامات اٹھانے کی پوزیشن میں ہے۔ اگر ان کا اعلامیہ صرف الفاظ پر ٹرخائے' اور وہ سب کو متفقہ لائحہ عمل بنانے کی دعوت دیتے رہیں' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یا تو وہ خالی الذہن ہیں' یا وہ کوئی عملی قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔

چوتھی اور آخری بات یہ ہے کہ بحیثیت قومی لیڈر۔ کہ' جس کو کسی وقت بھی ساری قوم کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے' ان کو باہمی اختلافات کو تلخی کی اس حد تک نہ لے جانا چاہیے کہ جس کے بعد بات کرنا اور ساتھ بیٹھنا ہی ناممکن ہو جائے۔ گزشتہ چند دنوں میں ان کی' اور ان کے رفقائے کار کی زبان' تعلقات میں تلخی کا زہر گھولتی رہی ہے۔ کبھی "غدار" کہا گیا' کبھی "لات مار کر نکال دینے" کی دھمکی دی گئی' کبھی "کسی قیمت پر بھی ہاتھ نہ ملانے" کا عہد کیا گیا' کبھی "ہاتھ پاؤں توڑ دینے" کی دھمکی دی گئی۔ وزیرِاعظم ہوں یا ان کے وزرا' جو ملک و قوم کو چلا رہے ہوں انہیں یہ زبان زیب نہیں دیتی۔ تلوار کے گھاؤ مندمل ہو

جاتے ہیں' زبان کے گھاؤ مندمل ہو کر نہیں دیتے۔

ہم اپوزیشن سے بھی چند باتوں پر غور کرنے کی دردمندانہ اپیل کرتے ہیں۔ بعض ملی اور قومی امور ایسے ہوتے ہیں جن پر ہر پاکستانی کو تمام اختلافات و تنازعات اور جماعتی مفادات سے بالاتر ہو کر' اور تمام شکایات فراموش کر کے' اپنی سوچ اور پالیسی تشکیل کرنا چاہیے۔ اگر آج بھارت' پاکستان پر حملہ کر دے' تو قوم کے ہر فرد کو سارے اختلافات بھلا کر ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے جو ملک چلانے کے ذمہ دار ہوں۔ بابری مسجد کا مسئلہ بھی ایک ایسا ہی مسئلہ ہے۔ اس سے ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور دین و ایمان کا مستقبل وابستہ ہے۔ وہ مسلمان جو' مسلمان ہونے کے جرم کے علاوہ' آج تک پاکستان بنانے کے جرم کا بھی تاوان ادا کر رہے ہیں۔ اس لیے ان کی طرف سے ملک کے مسائل اور بابری مسجد کے مسئلہ کو ایک ساتھ نتھی کرنے کی روش کسی طرح صحیح نہیں۔

دوسرے' جناب وزیراعظم نے کتنی ہی بے تدبیریاں کی ہوں اور ان کی طرف سے کتنے ہی دکھ پہنچے ہوں' اس وقت بابری مسجد کے مسئلہ کا تقاضا یہ ہے کہ اپوزیشن بھی کسرِ انکسار سے کام لے کر وزیراعظم کی دعوت قبول کر لے' اور ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کو عملی اقدامات کرنے پر مجبور بھی کرے' اور ان اقدامات میں ان کے ساتھ تعاون بھی کرے۔

جہاں تک جماعتِ اسلامی کا تعلق ہے تو وہ ماضی میں ہمیشہ درج بالا روش پر گام زن رہی ہے۔ ۱۹۶۴ میں جنرل ایوب خاں نے جماعتِ اسلامی کے خلاف گندی مہم چلائی' اسے غیر قانونی قرار دیا' اس کی قیادت کو ۹ ماہ جیل میں رکھا' لیکن جب ۱۹۶۵ کی جنگ شروع ہوئی تو سید مودودیؒ دوسرے قومی لیڈروں کے ہمراہ' صدر ایوب کے بلانے پر ان کے پاس گئے' اور جنگ میں ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ ۱۹۷۱ کے حادثہ کے بعد' جب جناب بھٹو شملہ مذاکرات کرنے کے لیے ہندوستان گئے' تو اس وقت کے امیرِ جماعت' میاں طفیل محمد صاحب نے ائیرپورٹ جا کر ان کو رخصت کیا' تاکہ بھارت کو یہ معلوم ہو جائے کہ' سارے اختلافات کے باوجود' قوم بھارت کے خلاف متحد ہے۔ حالانکہ جناب بھٹو نے جماعت کے ساتھ' اور ذاتی طور پر محترم میاں صاحب کے ساتھ' عناد اور بد سلوکی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

جماعتِ اسلامی کو اپوزیشن اور وزیراعظم دونوں کی طرف سے شرکت کی دعوت ملی تھی۔ اگر ہمیں ذرہ برابر بھی یہ احساس ہوتا کہ ان میں کسی ایک یا دونوں کانفرنسوں میں ہماری شرکت سے بابری مسجد کے مقصد کو تقویت پہنچے گی' تو ہم سر کے بل وہاں جاتے۔ نہ ہمیں محترمہ بے نظیر

بھٹو کے پاس جانے میں عار ہوتا' نہ جناب وزیراعظم کے پاس جانے میں۔ لیکن جب ہم نے محسوس کیا کہ بابری مسجد تو اب پس پشت چلی گئی ہے' اور اب ان کانفرنسوں میں شرکت کسی فریق کی تقویت کا باعث ہو گی' نہ کہ بابری مسجد کے مقصد کی تقویت کا' تو ہم نے یہی فیصلہ کیا کہ ہم دونوں سے علیحدہ رہیں۔ لیکن اگر آج بھی کوئی ایسی کانفرنس ہو جس کا مقصدِ وحید بابری مسجد ہو' تو ہم اس میں ضرور شریک ہوں گے۔

بابری مسجد کا سانحہ بڑا دل دوز سانحہ ہے۔ لیکن یہ دل کی زندگی اور بالآخر ملت اور انسانیت کی زندگی کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو افتاد بھی پڑتی ہے وہ' اگر اتمامِ حجت اور عذاب کے لیے نہ ہو' ہمیشہ اپنے اندر ذکروانذار کا سامان رکھتی ہے۔ اس کے اندر یہ پیغام مضمر ہوتا ہے کہ جاگو' اپنی حالت بدلو' اور قدم بڑھاؤ۔

فلسطین ہو' کشمیر ہو' بوسنیا ہو' بھارت ہو' سری لنکا ہو' برما ہو' صومالیہ ہو ---- یہ سب قدرت کی طرف سے تذکیروانذار کا سامان ہے۔ یہ سب مسلمانوں کے لیے قدرت کے اشارے ہیں کہ مستقبل میں امامت عالم ان کی منتظر ہے۔ بشرطیکہ وہ سوچیں کہ یہ سب کچھ کیوں پیش آ رہا ہے' اور اس کا علاج کیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں نبوتِ محمدیؐ کے خصائص بتاتے ہوئے ایک بات یہ بھی فرمائی کہ جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا (ساری زمین میرے لیے مسجد بنا دی گئی ہے)۔ اس جملہ کے ایک معنی تو یہ ظاہر ہیں کہ مسلمان روئے زمین پر کسی جگہ بھی عبادت کر سکتا ہے' وہ کسی عبادت گاہ یا مسجد کا محتاج نہیں۔ لیکن اس بات کے معانی میں ایک عہد بھی مضمر ہے کہ نبوتِ محمدیؐ ' اور اس کے وارث' ساری زمین کو مسجد بنانے کے مشن پر مامور ہیں' اور ایک بشارت بھی کہ اس نبوت کے نتیجہ میں ساری زمین مسجد بننے والی ہے۔ چنانچہ یہ بشارت پوری ہوئی' اور دنیا نے وصالِ نبویؐ کے بعد چند ہی سالوں میں اپنی چشمِ سر سے اس کی تکمیل کا نظارہ دیکھ لیا۔

مسجد' خواہ وہ مسجدِ نبوی ہو یا مسجدِ قرطبہ یا بابری مسجد یا بادشاہی مسجد' صرف اس لیے نہیں بنائی جاتی کہ روئے زمین کے ایک گوشہ کو نماز اور قیام و سجود کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ ہجرت کے فوراً بعد مسجدِ نبویؐ کی تعمیر' نماز کے لیے جماعت کی شرط' جمعہ کے لیے دوڑ پڑنے کا حکم' جہاں مسلمان بسے وہاں سب سے پہلے مسجد کی تعمیر--- یہ سب مسجد کی اس حقیقت کو عیاں

کرتے ہیں کہ اس کا مقصد روئے زمین کو مسجد بنانا ہے۔ جس طرح مسجدِ نبویؐ سے وہ نور نکلا جس نے سارے عالم کو منوّر کر دیا' اسی طرح ہر مسجد کو اس نور کا مخزن و منبع ہونا چاہیے جو اپنے ماحول کو منوّر کر دے۔

آج دنیا میں ایک ارب مسلمان ہیں لیکن اپنے مشن سے غافل' اور لاکھوں مسجدیں ہیں لیکن اس نور سے خالی۔ نتیجہ یہ ہے کہ سارا عالم ایک خارزار جنگل بن گیا ہے' اور سنتِ الٰہی کے مطابق اس خارزار جنگل کا سب سے زیادہ خارزار حصہ اسی امت کے حصہ میں آیا ہے جس کو اس عالم کو باغ و بہار بنا کر رکھنے کا مشن سپرد کیا گیا تھا۔

چنانچہ آج مسلمان پر ہر جگہ جو افتاد پڑ رہی ہے اس پر افسوس تو فطری اور بجا ہے' تعجب و یاس کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ تاریخ کی گردش نے مسلمان کو پھر اس مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں قدرت' اقبال کے الفاظ میں' اسے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اگر وہ' امامتِ مسجد سے گزر کر' امامتِ عالم کا فریضہ ادا کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے' تو ساری زمین مسجد بننے کی منتظر ہے' عصرِ حاضر کی روح شرعِ پیغمبر کے آشکار ہونے کے انتظار میں مضطرب و بے چین ہے' اور فردا اسلام کا مقدر ہے۔

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ اُمم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

جماعتِ اسلامی: حکمتِ عملی اور لائحہ عمل

مرتبہ: خرّم مراد

نصب العین اور منزل

رضائے الٰہی اور اقامتِ دین

مومن کا اصل مقصدِ زندگی رضائے الٰہی کا حصول اور آخرت کی فلاح ہے۔ مگر اس مقصد کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں خدا کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے مومن کا عملی نصب العین اقامت دین' اور حقیقی نصب العین وہ رضائے الٰہی ہے جو اقامت دین کی سعی کے نتیجہ میں حاصل ہوگی۔ (دستور جماعتِ اسلامی' ص ۱۶)

ہمہ گیر عالمی انقلاب

یہ بات ہر اس شخص کو جو جماعتِ اسلامی میں آئے اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے' کہ جو اس جماعت کے پیش نظر ہے وہ کوئی ہلکا اور آسان کام نہیں ہے۔ اسے دنیا کے پورے نظامِ زندگی کو بدلنا ہے۔ اسے دنیا کے اخلاق' سیاست' تمدن' معیشت' معاشرت' ہر چیز کو بدل ڈالنا ہے۔ دنیا میں جو نظامِ حیات خدا سے بغاوت پر قائم ہے اسے بدل کر خدا کی اطاعت پر قائم کرنا ہے' اور اس کام میں تمام شیطانی طاقتوں سے اس کی جنگ ہے۔ (روداد اوّل' ص ۱۶' اجتماع اوّل ۱۹۴۱)

ہمارے پیش نظر صرف ایک سیاسی نظام کا قیام نہیں ہے۔ بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی ــــــ انفرادی اور اجتماعی ــــــ میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے۔ (روداد سوم' ص ۵۶' تقریر "دعوتِ اسلامی اور اس کا طریق کار" ۱۹۴۵)

انقلابِ امامت

ہماری جدوجہد کا آخری مقصود انقلابِ امامت ہے۔ یعنی دنیا میں ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں' وہ یہ ہے کہ فساق و فجار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامتِ صالحہ کا نظام قائم ہو۔

اور اس سعی و جہد کو ہم رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ (روداد سوم' ص ۲۸' تقریر "تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" ۱۹۴۵)

کسی شخص کو اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ "سیاست" کوئی عارضہ تھا جو جماعتِ اسلامی کو قیامِ پاکستان کے بعد کسی وقت یکایک لاحق ہوگیا... یہ بات کسی اشتباہ کی گنجائش کے بغیر پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ زمامِ کار کی تبدیلی کو ہمارے نظامِ فکر و عمل میں آغازِ تحریک ہی سے بنیادی اور مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر میں بلا خوف تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ دراصل یہی وہ امتیازی وصف ہے جو زمانۂ قریب کی تاریخ میں' کم از کم برعظیم ہند کی حد تک' جماعتِ اسلامی کی تحریک کو دوسری تحریکوں سے ممیز کرتا ہے۔ (تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل' ص ۸۵۔ ۸۶' تقریر اجتماعِ ارکان "ماچھی گوٹھ" ۱۹۵۷)

بنیادی طریقِ کار کے اصول

انبیاء علیہم السلام کا طریقہ

اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بدل دینا ہے۔ یہ کُلّی و اساسی تغیر صرف اسی طریقہ پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش' سوم' بحوالہ آئندہ لائحہ عمل' ص ۳۷)

اس نصب العین کی طرف پیش قدم کرنے کے لیے راہ راست وہی ہے جو اللہ کے رسولؐ نے اختیار کی۔ یعنی یہ کہ لوگوں کو الھدیٰ اور دینِ حق کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کرکے اپنی بندگی و اطاعت اللہ کے لیے خالص کردیں... ان کا ایک مضبوط جتھا بنایا جائے۔ پھر یہ جتھا تمام ان اخلاقی' علمی اور مادی ذرائع سے جو اس کے امکان میں ہوں' دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے جہاد کبیر کرے۔ (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش' سوم' بحوالہ آئندہ لائحہ عمل' ص ۳۴' ۳۵)

دستوری طریقِ کار

جدید دستور کی دفعہ ۱۰ (حالیہ دستور کی دفعہ ۵) میں جماعت کا مستقل طریقِ کار یہ بیان کیا گیا ہے

... (۳) جماعت اپنے پیشِ نظر اصلاح اور انقلاب کے لیے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام

کرے گی' یعنی یہ کہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعہ سے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے ' اور رائے عام کو ان تغیرات کے لیے ہموار کیا جائے جو جماعت کے پیش نظر ہیں۔
(۴) جماعت اپنے نصب العین کے حصول کی جدوجہد خفیہ تحریکوں کے طرز پر نہیں کرے گی' بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کرے گی۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۵۸۔ ۵۹' اور دستور' ص ۱۶)

مقصد اور تدابیر

اصولی طریقِ کار یہی ہے کہ پہلے ہم اپنی دعوت پیش کریں گے۔ پھر ان لوگوں کو جو ہماری دعوت قبول کریں' منظم کرتے جائیں گے۔ پھر اگر رائے عام کی موافقت سے' یا حالات کی تبدیلی سے' کسی مرحلے پر ایسے آثار پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آجانا ممکن ہو' اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی' تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام کو اپنے اصول پر ڈھال سکیں گے' تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ بھی واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے' نہ کہ کسی خاص طریقے (method) سے۔ لیکن اگر پرامن ذرائع سے جوہرِ اقتدار (substance of power) ملنے کی توقع نہ ہو تو پھر ہم عام دعوت جاری رکھیں گے' اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے' (ترجمان القرآن' ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۵' بحوالہ آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۰۶)

الیکشن لڑنا اور اسمبلی میں جانا اگر اس غرض کے لیے ہو کہ ایک غیر اسلامی دستور کے تحت ایک لادینی (secular) جمہوری (democratic) ریاست کے نظام کو چلایا جائے تو یہ ہمارے عقیدۂ توحید اور ہمارے دین کے خلاف ہے۔ لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عام کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں یہ توقع ہو کہ عظیم اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور حکومت تبدیل کرسکیں گے' تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طریقے سے کام نہ لیں۔ جو چیز لڑے بھڑے بغیر سیدھے طریقے سے حاصل ہوسکتی ہو اس کو خواہ مخواہ ٹیڑھی انگلیوں ہی سے نکالنے کا ہم کو شریعت نے حکم نہیں دیا ہے۔ (ترجمان القرآن' دسمبر ۱۹۴۵' بحوالہ آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۰۷)

انفرادی لغزشوں اور کوتاہیوں سے تو بہرحال کوئی جماعت بھی خالی نہیں ہوسکتی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اجتماعی حیثیت سے جماعتِ اسلامی ان اصولوں کی پوری پابندی کرتی رہی ہے۔ . . . تدابیر کا ردّ و بدل ایک دوسری چیز ہے جسے بعض لوگ غلطی سے اصول کا ردّ و بدل قرار دے بیٹھتے

ہیں۔ تدبیروں کا نام اصول نہیں ہے' اور دنیا کی کوئی جماعت بھی ایک تدبیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پکڑ کر نہیں بیٹھ سکتی۔ خصوصیت کے ساتھ جن لوگوں کو سخت مخالف و مزاحم ماحول میں سے اپنا راستہ نکالنا ہو' ان کے لیے تو یہ ناگزیر بھی ہے' اور دانائی کا تقاضا بھی' کہ اگر ایک وقت انہوں نے ایک تدبیر کو صحیح و مناسب پاکر اختیار کیا ہو اور دوسرے وقت وہ تدبیر موزوں اور کارگر نہ رہے' تو وہ بلا تامل اس کو کسی بہتر اور حالات کے لحاظ سے مناسب تر تدبیر سے بدل دیں۔

اس ردّ و بدل کو اس وقت تک اصول شکنی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا جب تک یہ ثابت نہ کردیا جائے کہ جن اصولوں کی پابندی کا ہم نے عہد کیا تھا ان کے حدود اربعہ میں اس ردّ و بدل کی' یا ہماری اختیار کردہ کسی تدبیر کی گنجائش نہ تھی۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۵۹۔ ۶۰)

اصول اور فروعات

عام مسلمانوں کے ذہن پر مدتوں کے غلط تصورات کی وجہ سے جزئیات و ظواہر کی اہمیت کچھ اس طرح چھا گئی ہے کہ دین کے اصول و کلیات اور دینداری و اخلاق اسلامی کے حقیقی جوہر کی طرف خواہ کتنی ہی توجہ دلائی جائے' مگر لوگوں کے دماغ پھر پھر کر انہی چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذرا ذرا سی ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں جنہیں اصل دین بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس وبائے عام کے اثرات خود ہمارے بہت سے رفقاء اور ہمدردوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

میں اپنا پورا زور یہ سمجھانے میں صرف کرتا رہا ہوں کہ دین کی حقیقت کیا ہے' اور اس میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے اور اس میں مقدم کیا ہے اور موخر کیا۔ لیکن ان ساری کوششوں کے بعد جب دیکھتا ہوں یہی دیکھتا ہوں کہ وہی ظاہر پرستی اور وہی اصول سے بڑھ کر فروغ کی اہمیت دماغوں پر مسلط ہے۔ آج تین روز سے میرے پاس پرچوں کی بھرمار ہو رہی ہے' جن میں سارا مطالبہ بس اس کا ہے کہ جماعت کے لوگوں کی داڑھیاں بڑھوائی جائیں' پائینچے ٹخنوں سے اونچے کرائے جائیں' اور ایسے ہی دوسرے جزئیات کا اہتمام کرایا جائے۔۔۔

وہ جزئیاتِ شرع جن کو آپ نے دین کے اولین مطالبات میں شمار کر رکھا ہے' تو ان کا حقیقی مقام میں آپ کے سامنے پھر ایک مرتبہ صاف صاف واضح کیے دیتا ہوں تاکہ میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔

سب سے پہلے ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول دنیا میں کس غرض کے لیے بھیجے ہیں۔ دنیا میں آخر کس چیز کی کمی تھی' کیا خرابی پائی جاتی تھی' جسے رفع

کرنے کے لئے انبیاء کو مبعوث کرنے کی ضرورت پیش آئی ؟ کیا وہ یہ تھی کہ لوگ داڑھیاں نہ رکھتے تھے اور انہیں رکھوانے کے لیے رسول بھیجے گئے ' یا یہ کہ لوگ ٹخنے ڈھانکے رہتے تھے اور انبیاء کے ذریعے سے انہیں کھلوانا مقصود تھا ؟ یا وہ چند سنتیں جن کے اہتمام کا آپ لوگوں میں بہت چرچا ہے ' دنیا میں جاری نہ تھیں اور انہی کو جاری کرنے کے لیئے انبیاء کی ضرورت تھی ؟ ان سوالات پر آپ غور کریں گے تو خود ہی کہہ دیں گے کہ نہ اصل خرابیاں یہ تھیں اور نہ انبیاء کی بعثت کا اصل مقصود یہ تھا ۔ (روداد' سوم ' ص ۲۵۲ ۔ ۲۵۳)

خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جن جزئیات پر آپ لوگ بحثیں کرتے ہیں' وہ خواہ کتنی ہی اہمیت رکھتی ہوں مگر' بہرحال یہ وہ چیزیں نہیں ہیں جن کو قائم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو مبعوث کیا ہو اور اپنی کتابوں کو نازل کیا ہو ۔ انبیاء کی بعثت اور کتبِ الٰہی کی تنزیل کا مقصد ان جزئیات کو قائم کرنا نہیں ہے ۔

ان کا اصل مقصد یہ رہا ہے کہ خلقِ خدا اپنے مالکِ حقیقی کے سوا کسی کے تابع فرمان نہ رہے' قانون صرف خدا کا قانون ہو ' تقویٰ صرف خدا سے ہو ' امر صرف خدا کا مانا جائے ' حق اور باطل کا فرق اور زندگی میں راہِ راست کی ہدایت صرف وہی مسلّم ہو جسے خدا نے واضح کیا ہے ' اور دنیا میں ان خرابیوں کا استیصال کیا جائے جو اللہ کو ناپسند ہیں' اور ان خیرات و حسنات کو قائم کیا جائے جو اللہ کو محبوب ہیں ۔

یہ ہے دین ' اور اسی کی اقامت ہمارا مقصد ہے ' اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسی کام پر ہم مامور ہیں ۔ اس کام کی اہمیت اگر آپ پوری طرح محسوس کرلیں' اور اگر آپ کو اس بات کا بھی احساس ہو کہ اس کام کے معطل ہوجانے اور باطل نظاموں کے دنیا پر غالب ہوجانے سے دنیا کی موجودہ حالت کس قدر شدت سے غضبِ الٰہی کی مستحق ہوچکی ہے' اور اگر آپ یہ بھی جان لیں کہ اس حالت میں ہمارے لیے غضبِ الٰہی سے بچنے اور رضائے الٰہی سے سرفراز ہونے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم اپنی تمام قوت' خواہ وہ مال کی ہو یا جان کی ' دماغ کی ہو یا زبان کی ' صرف اقامت دین کی سعی میں صرف کردیں ' تو آپ سے کبھی ان فضول بحثوں اور ان لایعنی افکار کا صدور نہ ہوسکے جن میں اب تک آپ میں سے بہت سے لوگ مشغول ہیں ۔ میرے نزدیک یہ تمام مشاغل صرف اس ایک چیز کا نتیجہ ہیں کہ لوگوں نے ابھی تک اس بات کو پوری طرح سمجھا نہیں ہے کہ دین حقیقت میں کس چیز کا نام ہے' اور اس کے واقعی مطالبات اپنے پیروؤں سے کیا ہیں ۔ (روداد سوم ' ص ۸۹ ۔ ۹۰)

قیامِ پاکستان سے قبل حکمتِ عملی

تعلیم و تحقیق

ہمارے پیش نظر ایسے علماء اور ماہرین کا پیدا کرنا ہوگا جو زندگی کے مختلف شعبوں میں قیادت و رہنمائی کے اہل ہوں' جن میں یہ قابلیت ہو کہ اسلام کے اصولوں پر ایک پورے نظامِ تمدن کو تعمیر کرسکیں اور ایک جدید ترین اسٹیٹ کی تنظیم کا بار اٹھا سکیں۔ اس کے لیے جس علم' جس قوت اجتہاد' اور جس منتقیانہ سیرت کی ضرورت ہے وہ ان میں تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے پیدا کی جائے گی۔ (روداد' اول' ص ۶۵)

اگر ہمیں واقعی نظامِ تمدن و اخلاق میں کوئی انقلاب برپا کرنا ہے تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ . . . ایسا لٹریچر فراہم کریں جو اسلامی نظام کی پوری شکل و صورت سے دنیا کو آشنا کرے' اور اپنی تنقید سے موجودہ تہذیب و تمدن کی جڑیں اکھاڑ کر دلوں اور دماغوں میں نظامِ اسلامی کی صداقت کا یقین اور اس کے قیام کی خواہش پیدا کردے۔ نیز ہمیں قرآن' حدیث' فقہ اور تاریخِ اسلام کے متعلق جملہ علوم کی تدوین جدید کرنی ہوگی' اور اسی طرح علومِ جدیدہ کو بھی اسلامی نقطۂ نظر سے از سرِ نو مدوّن کرنا ہوگا۔ یہ کام کیے بغیر ہم ہرگز یہ توقع نہیں کرسکتے کہ مجرّد کسی عمومی یا عسکری تحریک سے کوئی حقیقی اسلامی انقلاب دنیا کے موجودہ نظامِ تمدن و اخلاق میں رونما ہو جائے گا۔ (روداد' اوّل' ص ۶۵-۶۶)

رائے عام

تعمیری کاموں کے ساتھ ہم دعوتِ عام کا کام بھی پوری قوت کے ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔ ہماری تعمیری کوششیں بے سود ہوجائیں گی اگر ساتھ ساتھ ان کی پشت پر ایک مضبوط رائے عام بھی تیار نہ ہوتی رہے۔ جس طرح . . . تعمیری کاموں کے بغیر کوئی اسلامی انقلاب رونما نہیں ہوسکتا' اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ عامہ الناس میں اسلام کی دعوت پھیلائے بغیر ایسا کوئی انقلاب برپا ہوسکے۔

ہمیں نہ صرف ہندوستان میں' بلکہ حتی الامکان دنیا کے گوشے گوشے میں' اپنی آواز پہنچانی ہوگی' کیونکہ آج کسی ایک ملک میں کوئی حقیقی انقلاب واقع نہیں ہوسکتا جب تک کہ وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی رائے عام اس کی تائید میں تیار نہ کرلی جائے۔ اربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے' کروڑوں انسانوں کو کم از کم اس حد تک اس سے متاثر ہو جانا چاہیے کہ اس

چیز کو حق مان لیں جس کے لیے ہم اٹھ رہے ہیں' لاکھوں انسانوں کو ہماری پشت پر اخلاقی اور عملی تائید کے لیے آمادہ ہونا چاہیے' اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں کی تیار ہونی چاہیے جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصد عظیم کے لیے کوئی خطرہ' کوئی نقصان' کوئی مصیبت برداشت کرنے میں تامل نہ کریں۔ (روداد' اوّل' ص ۶۶- ۶۷)

عوامی مظاہر

تحریکِ اسلامی اپنا ایک خاص مزاج رکھتی ہے اور اس کا ایک مخصوص طریقہ کار ہے جس کے ساتھ دوسری تحریکوں کے طریقے کسی طرح جوڑ نہیں کھاتے . . . جلسے اور جلوس' جھنڈے اور نعرے' یونیفارم اور مظاہرے' ریزولیوشن اور ایڈریس' بے لگام تقریریں اور گرماگرم تحریریں' اور اس نوعیت کی تمام چیزیں ان تحریکوں کی جان ہیں مگر اس تحریک کے لیے سمِّ قاتل ہیں۔

عوامی بہاؤ

آپ کو زبان یا قلم یا مظاہروں سے عوام پر سحر نہیں کرنا ہے کہ ان کے ریوڑ کے ریوڑ آپ کے پاس آجائیں اور آپ انہیں ہانکتے پھریں۔

عوامی تحریک اور صالح جماعت

ہمیں عوام میں ایک عمومی تحریک (mass movement) چلانے سے پہلے ایسے آدمیوں کو تیار کرنے کی فکر کرنی ہے جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں' اور ایسی اعلیٰ درجے کی دماغی صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں کہ تعمیر افکار کے ساتھ اجتماعی قیادت کے دہرے فرائض کو سنبھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک کو پھیلا دینے کے لیے جلدی نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت یہ ہے کہ ملک کے اہلِ دماغ طبقوں کو متاثر کیا جائے' اور ان کو کنگال کر صالح ترین افراد کو چھانٹ لیا جائے جو آگے چل کر عوام کے لیڈر بھی بن سکیں اور تہذیبی و تمدنی معمار بھی۔ . . .

یہ اعتراض بجا ہے کہ کثیر التعداد عوام کو اس نقشے کے مطابق بلند سیرت بنانے کے لیے مدتِ مدید درکار ہے۔ مگر ہم اپنے انقلابی پروگرام کو عوام کی اصلاح ہوچکنے کے انتظار میں ملتوی کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے پیشِ نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کے لیے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کرلی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیرکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقے کے عوام کو سنبھال سکے۔ اس کی ذات عوام کا مرجع بن جائے اور بالکل فطری طریقے سے عوام کی لیڈر

شپ کا منصب اسے حاصل ہوجائے۔ مگر صرف مرجعیت سے بھی کام نہیں چلتا۔ اس سے کام لینے کے لیے دماغی صلاحیتیں بھی ہونی چاہئیں تاکہ ان کی مرکزی شخصیتوں کے ذریعہ سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صَرف ہوں۔ (روداد' اوّل' بحوالہ آئندہ لائحہ عمل ص ۱۰۸ - ۱۰۹)

قیامِ پاکستان کے بعد حکمت عملی میں تغیرات

لٹریچر اور حالات کا سیاق و سباق

آج بعض لوگ حالات کے سیاق و سباق کو نظرانداز کرکے ... بعض اقتباسات پیش کرکے ان سے چند بالکل غلط نتائج نکال رہے ہیں... یہ... مضامین جن کا وہ حوالہ دیتے ہیں' ۱۹۴۰ کے لکھے ہوئے ہیں ۔اس وقت بحث یہ نہیں تھی کہ مسلمانوں کی لادینی قومی جمہوری ریاست تو وجود میں آگئی ہے' اب اسے اسلامی ریاست و حکومت میں تبدیل کیسے کیا جائے۔ بلکہ یہ بحث تھی کہ ہم دارا لکفر میں رہتے ہوئے ایک اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنے کی جدّوجہد کا آغاز کس طرح کریں (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۱۰-۱۱۱)

جو لوگ اس تحریک کے درمیانی مراحل میں آئے ہیں' یا آئندہ آئیں گے وہ اسے صرف اس کے لٹریچر سے سمجھنے کی کوشش کریں گے' اور ان کے سامنے وہ حالات نہ ہوں گے جن میں مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے یہ لٹریچر پیدا ہوتا رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی خاص دور کی لکھی ہوئی کسی عبارت سے کوئی شخص الٹے معنی برآمد کر بیٹھے اور الجھنوں میں مبتلا ہوجائے۔ حالانکہ ایک تحریک کے لٹریچر کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر دور میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو پڑھتے ہوئے وہ حالات بھی آدمی نگاہ میں ہوں جن میں وہ لکھا گیا تھا۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۸۴)

طریقِ کار اور حالات میں تغیر

جن حالات میں ہم نے اقامتِ دین کی جدّوجہد کے لیے مطالبہ دستورِ اسلامی کو نقطۂ آغاز کی حیثیت سے منتخب کیا تھا ان میں پیش قدمی کا یہی ایک راستہ صحیح تھا۔ فطری طریقِ انقلاب، کا یہ تصور کہ وہ کوئی ایسا لگا بندھا طریقہ ہے جو ہر جگہ ہر طرح کے حالات میں ایک ہی ڈھنگ پر چلنا چاہیے' سراسر ایک غیر معقول تصور ہے۔ ایک نئی نئی آزاد ہونے والی مسلمان قوم کے اندر

انقلاب لانے کا فطری اور معقول راستہ وہ نہ تھا جس پر قبل تقسیم کے حالات میں ہم کام کر رہے تھے۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۵۸)

اب مجھے . . . آپ کو یہ بتانا ہے کہ تقسیم کے موقع پر اور اس کے فوراً بعد حالات میں کتنا عظیم اور بڑی حد تک غیر متوقع تغیر واقع ہوگیا، ان بدلے ہوئے حالات کے تقاضے قبل تقسیم کے حالات سے کس قدر مختلف تھے، اسلامی تحریک کے نقطۂ نظر سے ان کے موافق اور مخالف پہلو کیا تھے، ان میں کام کرنے کے لیے کیا نئے مواقع ہمارے سامنے آئے اور کیا نئے ذرائع ہمیں بہم پہنچے، تقسیم سے پہلے ہمارے لیے آئینی ذرائع سے نظام حکومت کو بدلنے اور قیادت میں انقلاب لانے کے جو دروازے شرعی موانع کی وجہ سے بالکل بند تھے انہیں کھولنے کے کیا نئے امکانات پیدا ہوگئے، اور اس پوری صورت حال کا بروقت اور بالکل ٹھیک اندازہ کرکے ہم نے اپنے سابق طریق کار میں جو تغیر کیا اس کی حقیقی نوعیت کیا تھی اور وہ کیوں نہ صرف صحیح اور نہ صرف ناگزیر تھا بلکہ اگر ہم ان حالات میں قبل تقسیم کے طریقے ہی پر کام کرتے رہتے تو اپنے مقصد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دیتے . . . (آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۲۰ – ۱۲۱)

با اختیار مسلم عوام میں کام کے تقاضے

اس تغیر عظیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان کے نظامِ زندگی کی شکل کا تعین بالکل مسلمانوں کی رائے عام پر منحصر ہوگیا، درآں حالیکہ متحدہ ہندوستان میں وہ غیر مسلموں کی رائے پر منحصر تھا۔ اور اس فرق عظیم کے واقع ہوجانے کے بعد یہ ضروری ہوگیا کہ ہم اسلامی نظام زندگی کے لیے اس غالب مسلم آبادی کے ملک میں کام کرنے کا ڈھنگ اس ڈھنگ سے مختلف اختیار کریں جو ہم کو غالب غیر مسلم آبادی کے ملک میں اس کام کے لیے اختیار کرنا پڑ رہا تھا۔

اگرچہ مسلمانوں کی اعتقادی اور اخلاقی کمزوری کو نظر انداز کرکے محض "مسلمان" ہونے کے مفروضے پر ایک عمارت کھڑی کر دینا بڑی حماقت ہے، لیکن اس سے کچھ کم درجے کی حماقت یہ بھی نہیں ہے کہ اسلام کے لیے ان کی عقیدت، اور اس کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی، اور اس کی طرف ان کے فطری میلان و رجحان کو نظر انداز کرکے آدمی ان کے درمیان اس طرح کام کرنے لگے جس طرح کسی منکر اسلام یا مخالف اسلام آبادی میں کیا جاتا ہے۔

کسی ملک میں ایک غالب مسلم آبادی کی موجودگی اسلامی نظام کے حق میں رائے عام تیار کرنے کے جو مواقع بہم پہنچاتی ہے ان سے فائدہ نہ اٹھانا اور زمامِ کار کی تبدیلی کے لیے جدوجہد کے جو راستے اس بنا پر کھل سکتے ہیں انہیں بند سمجھ لینا کسی صاحب عقل آدمی کا کام نہیں ہوسکتا۔

(آئندہ لائحہ عمل، ص ۱۲۳)

وقت کا چیلنج

صاف معلوم ہوگیا [تھا] کہ اس وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکرے گروہ کے ہاتھ میں ہیں، یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام میں لگے رہنے کا نہیں ہے۔ . . .

ہمارے سامنے کام کا جو نقشہ تھا اس کے لحاظ سے ہم کسی عوامی تحریک کے آغاز سے پہلے یہ چاہتے تھے کہ ہمارے پاس ایسے کارکنوں کا ایک گروہ موجودہ ہو جو نظم و ضبط کے اعتبار سے خوب پختہ اور سیرت و اخلاق کے اعتبار سے پوری طرح قابلِ اعتماد ہوں، ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ہر میدان میں مخالف نظریات و افکار کو شکست دینے اور ایک نیا نظام تعمیر کرنے کے لائق ہوں، اور ان میں قیادت کی صلاحیتیں بھی اس حد تک پائی جاتی ہوں کہ ان میں کا ایک ایک آدمی ایک ایک علاقے کا لیڈر بن سکے اور عوام کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق باقاعدگی کے ساتھ ابھار سکے اور منظم طریقے سے ساتھ لے کر چل سکے۔

ان اعتبارات سے ہم ابھی اپنے اندر بہت کچھ کمی محسوس کرتے تھے اور اپنی جماعت کو تیار کرنے کے لیے مزید وقت کے طالب تھے۔ لیکن ہمارے سامنے اس وقت اصل سوال یہ نہیں تھا کہ ہم اس کمی کو پورا کریں یا نہ کریں، بلکہ اصل سوال یہ تھا کہ آیا ہم جماعتی حیثیت سے اس وقت حالات کے اس چیلنج کا جواب دینے کے قابل ہیں یا نہیں؟

دوسرے الفاظ میں اس وقت ہمارے سامنے معاملے کی نوعیت یہ نہ تھی کہ کام کے جو مواقع، اور راہ کی رکاوٹیں دور کرنے کے جو امکانات، اور مخالف حالات کی وجہ سے جو خطرات، ہمارے لیے آج پیدا ہوئے ہیں، وہ سب اس انتظار میں ٹھہرنے کے لیے تیار ہیں کہ ہم اپنی تیاریوں کی تکمیل کرکے میدان میں آئیں۔ بلکہ وقت یہ صورت حال لے کر ہمارے سامنے آیا تھا کہ ہر موقع ہاتھ سے جانے کے لیے اور ہر امکان ختم ہونے کے لیے اور ہر خطرہ واقع ہوجانے کے لیے پر تولے کھڑا ہے۔ لہٰذا اس وقت ہمیں فوراً اور بروقت یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا ہم فی الحقیقت اس درجہ کمزور اور ناقابلِ کار ہیں کہ پیش آمدہ مواقع اور امکانات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اور ان خطرات کو روکنے کے لیے بھی کچھ نہیں کرسکتے جو علانیہ آتے نظر آ رہے ہیں؟ اور اگر حقیقتاً ہماری طاقت ایسی گئی گزری نہیں ہے بلکہ سوال صرف مزید تکمیل کی سعی کا ہے، تو آیا ہمارے مقصد کے لیے یہ زیادہ مفید ہے کہ ہم اس تکمیل کی سعی میں لگے رہیں، اور تمام مواقع کھو دیں، سارے امکانات ضائع کردیں، ہر ممکن خطرے کو نازل ہوجانے دیں؟ یا یہ زیادہ بہتر ہے

کہ جتنی اور جیسی کچھ طاقت بھی اللہ نے ہمیں بخشی ہے اسے لے کر کام کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں' اور تکمیل کی مساعی جہاں تک بھی ممکن ہو اس کے ساتھ ساتھ کرتے رہیں۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۳۶ - ۱۳۸)

طریقِ کار میں تبدیلی اور اس کی حقیقی نوعیت

حالات کا جائزہ لینے اور اپنی طاقت اور ذرائع کا اندازہ کرنے کے بعد ہم نے اسلامی نظام کے مطالبے سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اور یوں ہماری تحریک نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ . .

جس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ وہ کیا تغیر تھا جو اس دور میں ہم نے اپنے سابق طریقِ کار میں کیا' اور اس کی حقیقی نوعیت کیا تھی' اور نئے حالات میں اس خاص نوعیت کا تغیر کیوں مناسب ترین تھا۔

تقسیم سے پہلے جس طریق کار پر ہم کام کر رہے تھے اس کی عملی صورتوں سے قطع نظر' اصولاً" وہ اس نقشے پر مبنی تھا: ایک ایسی تحریک اٹھائی جائے جو اپنے بنیادی نظریے' اپنے مزاج' اپنی قیادت اور اپنے کارکنوں کی سیرت کے اعتبار سے صحیح معنوں میں اسلامی ہو۔ یہ تحریک ایک طرف معاشرے کی ذہنیت اور اس کی اخلاقی روح کو اسلام کے مطابق بدلنے کی کوشش کرے' دوسری طرف ایسے اصحابِ فکر تیار کرے جو نظامِ باطل کی نظری بنیادوں کو توڑنے اور نظامِ حق کی بنیاد پر نئی عمارت اٹھانے کی صلاحیت رکھتے ہوں' اور تیسری طرف نظامِ باطل کے خلاف عملاً کشمکش برپا کرکے اسے پیچھے دھکیلنے اور خود آگے بڑھنے کی سعی کرتی چلی جائے' یہاں تک کہ ان تین راستوں سے ایک ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے وہ منزل آ پہنچے جب معاشرے کی بدلی ہوئی آب و ہوا میں نظامِ باطل کا چلنا مشکل ہوجائے' نظامِ حق کے لیے جگہ چھوڑ دینے پر وہ مجبور ہو' اور اس نئے نظام کو سنبھالنے کے لیے موزوں آدمی بھی تیار پائے جائیں۔ . . .

تقسیم کے بعد اس اصولی طریقِ کار میں درحقیقت کوئی بنیادی تغیر نہیں کیا گیا۔ ہماری تحریک کی اساس وہی رہی جو پہلے تھی۔ معاشرے کی ذہنیت اور اس کی اخلاقی روح کو بدلنا اسی طرح ہمارے پروگرام کا ایک لازمی جزو رہا جس طرح پہلے تھا۔ اصحابِ فکر کی تیاری کے لیے بھی ہم انہی دو راستوں سے کام کرتے رہے جن سے پہلے کام کر رہے تھے۔ اور نظامِ باطل کے خلاف کشمکش جس کا اب ہم نے آغاز کیا وہ بھی نئی چیز نہ تھی بلکہ پہلے سے ہمارے طریقِ کار میں شامل تھی۔

اب جس چیز کو تغیر کہا جاسکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم نے حالات کی تبدیلی کے ساتھ اس طریقِ کار پر عمل درآمد کی شکل تبدیل کردی۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۴۰- ۱۴۳)

اپیل کے طریقے میں تبدیلی

پہلی تبدیلی ہم نے اپنے اپیل کے طریقے میں کی' کیونکہ اب ہم ایک ایسے ملک میں کام کر رہے تھے جس کی غالب آبادی' قریب قریب ۹۰ فی صد' مسلمانوں پر مشتمل تھی' اور جس میں نظام زندگی کے بننے اور بگڑنے کا انحصار مسلمانوں ہی کی عام خواہش پر تھا' ظاہر ہے کہ یہاں اپیل کا بعینہٖ وہ طریقہ موزوں نہ ہوسکتا تھا جو غالب غیر مسلم آبادی کے ملک میں اختیار کیا جا رہا تھا۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۴۳)

کام کے ڈھنگ میں تبدیلی

دوسری تبدیلی ہم نے اپنے کام کے ڈھنگ میں کی۔ پہلے ہم مواقع کے فقدان کی وجہ سے دعوت' توسیع نظام جماعت' اور اصلاح معاشرہ کا کام صرف چند متعین طریقوں سے بہت محدود پیمانے پر کر رہے تھے۔ اب مواقع بہم پہنچتے ہی ہم نے یہ تینوں کام وسیع پیمانے پر کرنے شروع کردیے' اور مطالبہ نظام اسلامی کی جدوجہد کو ان کا وسیلہ بنایا۔ اس جدوجہد نے ہمارے لیے یہ راستہ کھول دیا کہ لاکھوں آدمیوں تک اپنی دعوت پہنچائیں' ان میں سے ہزاروں کو اپنی تحریک کے ساتھ رکن یا متفق یا ہمدرد و متاثر کی حیثیت سے وابستہ کرلیں' اور معاشرے میں اسلامی نظام کی حمایت اور اس کی طلب کا عام جذبہ پیدا کرتے چلے جائیں' جس کا لازمی نتیجہ غیر اسلامی قدروں کے مقابلے میں اسلامی قدروں کا فروغ ہے۔

لیکن اس تبدیلی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پہلے طریقے کو ہم نے بالکل ترک کرکے صرف اس دوسرے طریقے ہی پر اعتماد کرلیا۔ اس توسیعی کوشش کے ساتھ ہم اپنے سابق طریقے کے مطابق استحکام کی سعی بھی کرتے رہے ہیں اور اس کی اہمیت و ضرورت ہماری نگاہ میں علیٰ حالہٖ قائم ہے۔

البتہ جن نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم کو تقسیم کے بعد اٹھنا پڑا تھا ان سے عہدہ برآ ہونا اس مستحکم توسیع کے ذریعہ سے ممکن نہ تھا جو دھیمی رفتار سے محدود پیمانے پر ہی ہوسکتی ہے۔ اور یہ بات صحیح بھی نہ تھی کہ بڑے پیمانے پر توسیع کے جو مواقع ہمیں حاصل ہوئے تھے ان کو ہم چھوڑ دیتے' اور بجائے خود اس توسیع کے جو فوائد ہیں ان کو نظر انداز کردیتے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۴۳ - ۱۴۴)

پیش قدمی کی رفتار میں تبدیلی

تیسری تبدیلی ہم نے اپنی پیش قدمی کی رفتار میں کی۔ پہلے جس اسکیم پر ہم کام کر رہے تھے

اس میں نظامِ باطل کی کار فرما طاقتوں سے براہ راست کشمکش کا مرحلہ بہت دیر میں آنا تھا' اور اس مرحلے میں بھی ہم کو آہستگی کے ساتھ بتدریج داخل ہونا تھا۔ خود ہماری جماعتی مشینری بھی اس سکیم کے لحاظ سے کشمکش کے تدریجی ارتقاء ہی کے لیے تیار ہوئی تھی۔ لیکن نئے حالات سے سابقہ پیش آتے ہی ہم نے دفعتہ" جدوجہد کے مرحلے میں قدم رکھ دیا' اور یہ جدوجہد بھی آہستگی کے ساتھ بتدریج بڑھنے والی نہ تھی' بلکہ یک لخت ملک گیر ہوجانے والی اور مختلف محاذوں پر پھیل جانے والی تھی۔

ہمارا اندازہ تھا' اور الحمدللہ کہ ہم اپنے اس اندازے میں غلط ثابت نہ ہوئے کہ ہماری جماعتی مشینری اس اچانک تبدیلی کو سہار لے جائے گی۔ دراصل وقت کی نزاکت کو سامنے رکھ کر اپنے مقصدِ عظیم کی خاطر ہم نے یہ ایک بڑا خطرہ محض اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر مول لیا تھا۔ اس میں اس امر کا پورا امکان تھا کہ ہمارا اندازہ غلط ثابت ہو' ... لیکن جس خدا کے بھروسے پر ہم نے یہ خطرہ مول لیا تھا اس نے ہماری مدد فرمائی اور ضائع ہونے کے بجائے محض اس کے فضل سے یہ اتنی ہی قوت اور وسعت پکڑتی چلی گئی جتنا اس پر کام کا بار بڑھتا چلا گیا۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۴۴ - ۱۴۵)

پیش قدمی کے نقشے میں تبدیلی

چوتھی اور بڑی اہم تبدیلی' جسے دراصل تبدیلی کے بجائے اجتہاد کہنا زیادہ صحیح ہے' ہم نے اپنی پیش قدم کے نقشے میں کی۔ اس کو میں تبدیلی کے بجائے اجتہاد کہنا اس لیے صحیح سمجھتا ہوں کہ ہمارے پاس ایسی کوئی اسکیم پہلے سے بنی ہوئی نہ تھی' اور ہو بھی نہیں سکتی تھی کہ نظامِ باطل کے خلاف ہماری کشمکش کا نقطۂ آغاز کیا ہوگا' پھر اس سے کشمکش کرتے ہوئے ہم کس راستے سے' یا کن کن راستوں سے اقامتِ حق کی جدوجہد میں پیش قدمی کریں گے' اور اس پیش قدمی کے دوران میں مزاحم طاقتوں کو روکنے اور پیچھے ہٹانے کے لیے ہمیں کیا کچھ کرنا ہوگا۔

یہ سب کچھ بہرحال حالات پر منحصر تھا۔ کوئی بھی اس کے لیے پیشگی مفصّل نقشہ نہ بنا سکتا تھا اور نہ تمام حالات میں ایسے کسی نقشے پر لگی بندھی جدوجہد کی جاسکتی تھی ... ہم نے وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر ٹھیک موقع پر یہ رائے قائم کی کہ کشمکش کا آغاز کرنے کے لیے اسلامی دستور کے مطالبہ سے زیادہ موزوں کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۴۵ - ۱۴۶)

تبدیلی کی ضرورت

اب یہ بات آخر آپ میں سے کس سے چھپی ہوئی ہے کہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے

واقعات کی دنیا کس قدر بدل گئی ؟ . . . "

بے شک میں نے ۱۹۴۰ء میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک طریق کار پیش کیا تھا' مگر کیا یہ کوئی عقل مندی ہوتی کہ ۷ ۴ء تک پہنچتے پہنچتے حالات میں جو عظیم تغیر رونما ہوگیا تھا اس کا ہم کوئی نوٹس نہ لیتے اور بدلے ہوئے حالات کو سمجھ کر اپنے ابتدائی طریق کار میں کوئی رد و بدل نہ کرتے ؟ بیشک میں نے اس طریقِ کار کو انبیاء کا طریقہ کہا تھا' اور آج بھی کہتا ہوں' مگر کسی صاحبِ عقل آدمی سے میں یہ توقع نہیں رکھتا کہ وہ ایک طریقِ کار کے بنیادی اصولوں اور حالات پر ان کے عملی انطباق کی مختلف اشکال کے درمیان فرق نہ کرے گا۔ اس طریقِ کار کے بنیادی اصول ہم نے کبھی نہیں بدلے' نہ انہیں بدلنے کے ہم قائل ہیں۔ لیکن جو شخص حالات اور مواقع اور ذرائع کی تبدیلی کے ساتھ ان اصولوں پر عمل در آمد کی شکلیں نہ بدل سکے اس کی مثال میرے نزدیک اس عطائی طبیب کی سی ہے جو کسی حکیم کی بیاض کا ایک نسخہ لے کر بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کر کے تمام مریضوں پر اسے جوں کا توں استعمال کرتا چلا جائے۔ (آئندہ لائحہ عمل ص ۱۱۵ - ۱۱۷)

توسیع و استحکام' دعوت عام' اور دین و سیاست

توسیع سے گھبرانے کی ضرورت نہیں' ہونے دیجیے

تحریکوں میں ایک چیز ہوتی ہے [توسیع] extension اور دوسری چیز [استحکام] consolidation۔ اگر ان دونوں چیزوں کے درمیان توازن باقی نہ رہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ توسیع زیادہ تیز رفتار سے ہوتی جاتی ہے جبکہ اسے مستحکم بنانے کے کام میں کمی آتی جاتی ہے۔ اس معاملے میں یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ یہ ایک فطری بات ہے۔ جتنا آپ کا کام بڑھے گا' آپ کی استحکامی قوت کی بہ نسبت توسیع کا کام زیادہ ہوگا۔

مثال کے طور پر آپ دیکھیے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ابتدائی تیرہ سال میں چند سو آدمی آپ کے ساتھ آئے۔ اس کے بعد چار پانچ سال کی مدت میں زیادہ سے زیادہ چند ہزار آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ لیکن جس وقت مکہ فتح ہوا اور حنین میں کفر و شرک کی زبردست قوت کو شکست دے دی گئی تو' جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے' . . . لوگ فوج در فوج آکر اللہ کے دین میں داخل ہوتے چلے گئے۔ . . .

ایک بڑی کثیر تعداد ان میں ایسی تھی جو دین کو پوری طرح سمجھ کر نہیں آئی تھی اور نہ دینی

اخلاق کو اپنے اندر جذب کر سکی تھی۔ دین کی روح ان کے اندر اچھی طرح پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یک لخت ارتداد کا دور شروع ہو گیا۔

اب دیکھیے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اس ارتداد کے طوفان کو پھیر دیا اور عرب کو پھر اسلام پر مضبوطی کے ساتھ جما دیا۔ وہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو Nucleus چھوڑ گئے تھے وہ اتنا زبردست تھا کہ اس نے اتنے بڑے ارتداد کو کچل کر رکھ دیا۔

اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر extension (توسیع) زیادہ بڑے پیمانے پر ہو جائے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ consolidation (استحکام) اگر پوری طرح سے نہ ہو سکے تو اس سے بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں ۔ اصل چیز یہ ہے کہ تحریک کا نیوکلیئس اتنا مضبوط ہو کہ وہ اپنے گرد ایک بڑا ہالہ جمع کر لے اور یہ ہالہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے۔ اور اگر وہ اس سے ہٹے تو وہ نیوکلیئس اور طاقتوں کو کھینچ کر اپنے ساتھ ملا لے۔۔۔

توسیع کتنی بھی ہوتی چلی جائے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ توسیع کو روکنے کی بھی ضرورت نہیں۔ توسیع ہونے دیجیے' لیکن نیوکلیئس مضبوط بناتے چلے جائیے۔ یہ چیز انشاء اللہ آپ کو اس پریشانی سے نکال دے گی کہ رفتارِ کار سست ہوتی جا رہی ہے یا کمزوریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ (تصریحات' ص ۳۹۰ ـ ۳۹۲)

توسیع اور استحکام کے درمیان توازن

توسیع اور استحکام کے درمیان توازن و تناسب ذہنی دنیا میں تو قائم کیا جا سکتا ہے' مگر عملی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص اگر آپ کے پاس شرک یا کفر سے توبہ کرنے کے لیے آئے' تو آخر کس عذر کی بنا پر آپ اسے الٹا واپس کر دیں گے ؟ کیا آپ اس سے یہ کہیں گے کہ اس وقت میں استحکام میں مصروف ہوں' اور توسیع کا کام میں نے فی الحال بند کر رکھا ہے ؟ (ترجمان القرآن' دسمبر ۱۹۵۳' بحوالہ رسائل و مسائل' چہارم' ص ۲۹۰)

ہمارا کام' ہر انسان کے لیے

اسلام تمام انسانوں کے لیے ہے' اور ہر چیز جس کا انسان سے کوئی تعلق ہے اس کا اسلام سے بھی تعلق ہے' لہٰذا اسلامی تحریک ایک ہمہ گیر نوعیت کی تحریک ہے اور یہ خیال کرنا غلط ہے کہ اس تحریک میں کام کرنے کے لیے صرف خاص قابلیتوں اور خاص علمی معیار کے آدمیوں ہی کی ضرورت ہے' نہیں' بلکہ ہر انسان کے لیے کام موجود ہے' کوئی انسان بیکار نہیں ہے' جو شخص

جو قابلیت بھی رکھتا ہو اس کے لحاظ سے وہ اسلام کی خدمت میں اپنا حصہ ادا کر سکتا ہے۔ عورت' مرد' بوڑھا' جوان' دیہاتی' شہری' کسان' مزدور' تاجر' ملازم' مقرر' محرر' ادیب' ان پڑھ اور فاضل اجل' سب یکساں مفید ہو سکتے ہیں۔ (روداد' اوّل' ص ۱۵ - ۱۶)

تبلیغ کے ساتھ' اصلاح خلق اور خدمت خلق

آپ کے سامنے ایک کام تو یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے ہم خیالوں کی تعداد اسی طرح بڑھاتے چلے جائیں' اور دوسرا کام یہ ہے کہ عوام کے اندر بھی نفوذ کر کے ان کو اسلامی نظام برپا کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تیار کرنے کی کوشش کریں۔ پہلے کام کے لیے لٹریچر کا پھیلانا آج تک جتنا مفید ثابت ہوا ہے اس سے بدرجہا زیادہ آئندہ مفید ثابت ہو سکتا ہے' . . .اور دوسرے کام کے لیے تبلیغ و تلقین کے دائرے وسیع کرنے کے ساتھ اصلاحِ خلق اور خدمتِ خلق کی ہر ممکن کوشش کیجیے۔ (تصریحات' ص ۳۲۲' اجتماعِ ارکان لاہور' ۱۹۷۵)

تمام جماعتوں' حلقہ ہائے متفقین اور دوسرے کارکنانِ جماعت کا فرض ہے کہ وہ اپنے حالات اور وسائل کے مطابق حسبِ ذیل قسم کے کاموں کو اپنے ہاں زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کریں۔ . . .

غنڈہ گردی کے مقابلے میں لوگوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرنا' عام طور پر لوگوں کو ظلم و ستم سے بچانا' شہریوں کے اندر اخلاقی فرائض اور ذمہ داریوں کے احساس کو بیدار کر کے ان کی ادائیگی پر ان کو آمادہ کرنا اور شہروں اور دیہات کی اخلاقی حالت کو درست کرنا۔

(صدیوں کے انحطاط کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں اب بدی اور برائی منظم' بے باک' جری اور ایک دوسرے کی پشت پناہ بن چکی ہے اور نیکی اور شرافت اب انتشار' پست ہمتی' بزدلی اور کمزوری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس صورت حال کو پھر سے بدلنا ہے اور نیکی اور شرافت کو منظم' بے باک' نڈر بنا کر اسے معاشرہ کے ہر گوشے میں حکمراں طاقت کی حیثیت دینا ہے۔) (آئندہ لائحہ عمل' ص ۲۰ - ۲۱)

اخلاقی گوشے میں ہمارے کارکنوں کو تین کاموں پر اپنی قوت صرف کرنی ہوگی :

(۱) غنڈہ گردی کا انسداد۔

(۲) ہر قسم کے فواحش کا انسداد۔

(۳) رشوت و خیانت کی روک تھام۔

ان اغراض کے لیے ہم صرف اخلاقی تلقین ہی پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے' بلکہ معاشرے کے شریف عناصر کو ان برائیوں کے مقابلے میں منظم کرکے ان کے خلاف عملی جدوجہد بھی کرنا چاہتے ہیں۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۸۱)

بھڑکتے ہوئے مسائل و معاملات میں دخل اور کشمکش کے ذریعے دعوت

نظام بدلتا ہی اس وقت ہے جب کہ آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی رائے' ذہنیت' طرز فکر اور معیار پسند و ناپسند میں تغیر رونما ہوجاتا ہے۔ اور یہ تغیر آپ سے آپ اس بات کی ضمانت ہوتا ہے کہ اسی آبادی میں سے' جس نے یہ تغیر قبول کیا ہے' نئے نظام کو چلانے والے آدمی فراہم ہوجائیں گے۔

اس تغیر کی رفتار بہت سست ہوتی ہے جبکہ اس کے لیے کوشش کرنے والی تحریک زندگی کے بھڑکتے ہوئے مسائل و معاملات میں دخل دینے' اور مخالف تحریکوں اور طاقتوں کے ساتھ زور آزمائی کرنے سے گریز کرے۔ کیونکہ اس صورت میں تھوڑے لوگ ہی اس کو مجرّد اس کے خیالات اور اس کی ٹھنڈی تعمیری کوششوں کی بنا پر قابلِ اعتنا سمجھتے ہیں۔ لیکن جب وہ اپنے نظریات کی تبلیغ و دعوت کے ساتھ' آگے بڑھ کر ہر عملی مسئلے میں دخل دیتی ہے' اس میں اپنا نقطہ نظر دلائل کے ساتھ پیش کرتی ہے' مخالف قوتوں کی فکر و عمل پر مدلّل تنقید کرتی ہے' اور عملاً ان کے مقابلہ میں کشمکش شروع کردیتی ہے' تو روز بروز آبادی کا زیادہ سے زیادہ حصہ اس کی طرف متوجہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اگر اس کی تنقید اور تعمیری فکر اور سیرت و کردار میں کوئی جان ہوتی ہے تو ہر شعبۂ زندگی میں کام کرنے والے لوگ اس کے ہم خیال بنتے چلے جاتے ہیں۔

کشمکش' اور خصوصاً" جبکہ وہ زندگی کے عملی مسائل پر ہو' لمبی چوڑی کتابوں کے بغیر' خود لوگوں کو یہ سمجھا دیتی ہے کہ آپ جس چیز کو توڑنا چاہتے ہیں اس میں کیا خرابی ہے' اور جو کچھ بنانا چاہتے ہیں وہ کیا ہے اور کن اصول و نظریات پر مبنی ہے۔ اس کا کم از کم ایک واضح خلاصہ ہر اس شخص کا ذہن اخذ کرلیتا ہے جو ماحول میں سانس لے رہا ہو۔ اور کشمکش جتنی بڑھتی جاتی ہے اتنے ہی زیادہ لوگ اس سے متاثر ہو کر اپنی اپنی استعداد کے مطابق تبدیلی قبول کرتے چلے جاتے ہیں۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۸۷ - ۱۸۹)

ہمہ جہتی دعوت

دعوت کا کام [بعض لوگ] صرف اس کو شمار کریں گے جس پر "دعوت" کا عنوان لگا ہوا ہو' اور اصلاح معاشرہ کا کام ان کے خیال میں صرف وہ ہوگا جو اسی مخصوص نام کے ساتھ کیاگیا

ہو۔ رہے وہ کام جن پر "سیاست" کا عنوان چسپاں ہو تو وہ اسے "سیاسی کام" کے خانے میں ڈال دیں گے' اور یہ تسلیم نہ کریں گے کہ اس عنوان کے تحت دعوت' توسیعِ نظام' اور اصلاحِ معاشرہ کا بھی کوئی کام ہوا ہے۔ اس طرح بعض لوگوں نے مختلف عنوانات کے خانوں میں جماعت کے کام کو تقسیم کر رکھا ہے' اور زیادہ تر یہی چیز ان کے اس دعوے کی بنیاد ہے کہ جماعت کا سیاسی کام اس کے دوسرے کاموں سے بہت بڑھ گیا ہے۔

حالانکہ ہم جو اپنے لائحہ عمل میں چار عنوانوں پر کام کو تقسیم کرکے بیان کرتے ہیں تو وہ صرف یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ زندگی کے کن کن گوشوں میں ہمیں کن مقاصد کے لیے سعی کرنی ہے۔ اس کا یہ مطلب کبھی نہیں ہوتا' اور نہیں ہوسکتا کہ عملاً بھی یہ الگ الگ کام ہوں گے۔

واقعہ کے اعتبار سے تو ان میں سے ہر کام ایسا ہے جس میں آپ سے آپ بقیہ سارے کام بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب آپ دعوت کا کام کریں گے تو وہ مذہبی واعظوں کے طرز پر صرف دعوت ہی نہ ہوگی بلکہ توسیعِ نظام اور اصلاحِ معاشرہ کا مقصد بھی اس کے ساتھ خود بخود پورا ہوگا اور یہی آپ کا سیاسی کام بھی ہوگا۔ دوسری طرف جب آپ سیاسی کام کرنے اٹھیں گے تو یہ دوسری سیاسی پارٹیوں کے طرز پر محض سیاسی کام ہی نہ ہوگا' بلکہ اس کا افتتاح ہی دعوتِ دین سے کیا جائے گا' اور اس کے اندر لازماً توسیعِ نظام اور اصلاحِ معاشرہ کے عناصر بھی شامل ہونگے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۲۰۲ - ۲۰۳)

یہ مفروضہ کہ یہاں محض سیاسی جدوجہد ہی سے قیادت کی تبدیلی چاہی جا رہی ہے اور اس کے ساتھ کوئی متوازی کوشش ذہنی و فکری اور اخلاقی تبدیلی کے لیے نہیں ہو رہی ہے' تو اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ خلافِ حقیقت باتوں پر استدلال کی عمارت کو اٹھانا اس نقطۂ نظر کی کمزوری کا پہلا نشان ہے جس کے حق میں استدلال کا یہ طریقہ اختیار کیا جائے۔ آخر کون آدمی' جو جماعتِ اسلامی کے حالات سے واقف ہے' انصاف کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم آج تک محض سیاسی جدوجہد کے ذریعہ سے تبدیلیٔ قیادت کے لیے کوشاں رہے ہیں؟ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۹۰ - ۱۹۱)

دینی اور سیاسی تشخص

اور آخر وہ مذہب کون سا ہے جس کی تبلیغ کے لیے وہ ہم سے کہہ رہے ہیں؟ اگر وہ پادریوں والا مذہب ہے جو سیاست میں دخل نہیں دیتا' تو ہم اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ

قرآن و حدیث کا مذہب ہے جس پر ہم ایمان رکھتے ہیں' تو وہ سیاست میں محض دخل ہی نہیں دیتا بلکہ اس کو اپنا ایک جزو بنا کر رکھنا چاہتا ہے۔

کوئی کہتا ہے کہ تم پہلے مذہبی لوگ تھے' اب سیاسی گروہ بن گئے ہو۔ حالانکہ ہم پر کبھی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب ہم غیر سیاسی مذہب کے لحاظ سے "مذہبی" رہے ہوں' اور آج خدا کی لعنت ہو ہم پر اگر ہم غیر مذہبی سیاست کے لحاظ سے "سیاسی" بن گئے ہوں۔ ہم تو "اسلام" کے پیرو ہیں اور اسی کو قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ جتنا "مذہبی" ہے اتنے ہی ہم مذہبی ہیں اور ابتداء سے تھے اور وہ جتنا "سیاسی" ہے اتنے ہی ہم سیاسی ہیں اور ابتداء سے تھے۔ تم نے نہ کل ہمیں سمجھا تھا جب کہ ہم کو "مذہبی" گروہ قرار دیا۔ اور نہ آج سمجھا ہے جب کہ ہمارا نام "سیاسی جماعت" رکھا۔ سیاست اور مذہب میں تمہارا استاد یورپ ہے۔ اس لیے نہ تم نے اسلام کو سمجھا اور نہ ہمیں۔ (جماعتِ اسلامی کا مقصد' تاریخ اور لائحہ عمل' ۱۹۵۱' ص ۱۴)

میں خود نہ سپاسناموں کو پسند کرتا ہوں نہ پھولوں کے ہاروں اور ان کی بارش کو۔ یہ سب کچھ میری مرضی کے بغیر' بلکہ اس کے خلاف ہی ہوتا رہا ہے اور مجھے مجبوراً اس لیے گوارا کرنا پڑا ہے کہ ایک طرف سے اخلاص و محبت کا اظہار اگر کسی نامناسب صورت میں ہو تو دوسرا فریق بسا اوقات سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے۔

آپ ہی بتائیے کہ اگر میں کسی جگہ جا کر اتروں اور وہاں بہت سے لوگ ہار لے کر آگے بڑھیں تو کیا یہ کوئی اچھا اخلاق ہوگا کہ میں ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کردوں اور ان سے کہوں کہ لے جاؤ اپنے ہار' میں انہیں قبول نہیں کرتا۔ یا میں کسی دعوت میں بلایا جاؤں اور عین وقت پر مجھے معلوم ہو کہ داعیوں نے ایک سپاسنامہ نہ صرف تیار کرا رکھا ہے بلکہ طبع بھی کرالیا ہے اور میں کہوں کہ رکھو اپنا سپاسنامہ۔

یہ چیزیں اگر قطعی حرام ہوتیں تو میں ان کو رد کردینے اور ان کے مرتکبین کو ملامت کرنے میں حق بجانب بھی ہوتا۔ مگر محض کراہت اور خوفِ فتنہ کم از کم میرے نزدیک اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ میں اس پر سختی برتوں اور ان لوگوں کی دل شکنی کروں جو بہرحال مجھ سے کسی دنیوی غرض کی بنا پر محبت نہیں رکھتے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہوں اور یہی کر بھی رہا ہوں کہ لوگوں سے یہ طریقِ اظہارِ اخلاص چھوڑ دینے کی گزارش کروں۔ اس سے زیادہ اگر مجھے کچھ کرنا چاہیے تو وہ آپ مجھے بتا دیں۔

(ترجمان القرآن' ستمبر ۱۹۵۵' رسائل و مسائل)

معیارِ مطلوب' بگاڑ اور تربیت

معیارِ مطلوب

جماعت کے ارکان... ایک بہت بڑی دعوئی لے کر بہت بڑے کام کے لیے اٹھ رہے ہیں۔ اگر ان کی سیرتیں ان کے دعوئی کی نسبت سے اس قدر پست ہوں کہ نمایاں طور پر ان کی پستی محسوس ہوتی ہو تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے دعوے کو مضحکہ بنا کر رکھ دیں گے... جس بستی میں بھی آپ موجود ہوں وہاں عام آبادی سے آپ کے اخلاق بلند تر ہونے چاہئیں' بلکہ آپ کو بلندیٔ اخلاق' پاکیزگیٔ سیرت اور دیانت و امانت میں ضرب المثل بن جانا چاہیے۔ (روداد' اوّل' ص ۴۸)

ابتدائی بگاڑ

میں سمجھتا ہوں کہ ہماری انتہائی احتیاط کے باوجود ایک اچھی خاصی جماعت ہمارے نظام میں ایسی داخل ہو گئی ہے جسے فی الواقع اس کام سے کوئی گہری دلچسپی نہیں ہے۔ دلچسپی کے اس فقدان کی نمایاں علامت یہ ہے کہ یہاں اجتماع کے لیے دعوتِ عام دی گئی تھی' اور اعلان کیا گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ ارکان شریک ہونے کی کوشش کریں' مگر بہت سے ارکان کسی عذرِ معقول کے بغیر نہیں آئے' بلکہ بہت سوں نے عذر پیش کرنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ لوگوں کے لیے ان کے معمولی کام' ان کے روزمرہ کے مشاغل' ان کے خانگی امور' ان کے دنیوی مفاد اس سے بڑھ کر اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ جماعت کی پکار پر لبیک کہیں' اور اسی بنا پر وہ غیر اولی الضَّرَر ہونے کے باوجود بیٹھے رہ گئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے بہت سے رفقاء کو اس کام سے حقیقی دلچسپی و دل بستگی نہیں ہے...

یہ سرد مہری جس کا اظہار اس اجتماع کے موقع پر ہوا ہے' کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے جو اس وقت رونما ہوئی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ متعدد مقامات پر ہماری جماعت کے بعض یا اکثر ارکان ہفتہ وار اجتماعات میں شریک نہیں ہوتے' یا شریک ہوتے ہیں تو التزام کے ساتھ نہیں بلکہ "کتنڈے وار" طریقے سے کہ جب دنیا کی کوئی چھوٹی بڑی مشغولیت انہیں نہ ہوئی اور تفریح کو بھی جی چاہا تو مقامی جماعت کے اجتماع میں آ گئے۔ بعض مقامات پر ہفتہ وار اجتماع کا قاعدہ ہی سرے سے منسوخ کر دیا گیا ہے۔

اور بہت سے ارکان ایسے بھی ہیں جو جماعت میں داخل ہونے اور جان بوجھ کر خدا سے عہد غلامی تازہ کرنے کے بعد ویسے ہی ٹھنڈے' بے روح اور جامد و ساکن ہیں جیسے اس سے پہلے

تھے۔ نہ ان کی زندگی میں کوئی تغیر واقع ہوا' نہ جاہلیت کے ماحول سے ان کی کوئی جنگ ٹھنی' نہ دعوت الی اللہ کے لیے کوئی سرگرمی ان میں پیدا ہوئی اور نہ ہم سفر رفیقوں کے ساتھ وابستگی ان کے اندر پائی گئی۔ حالانکہ ہم نے ابتدا میں جماعت قائم کرتے وقت بھی کہہ دیا تھا' اور اس کے بعد بھی بار بار کہتے رہے ہیں کہ ہمیں کثرتِ تعداد کی نمائش کرنے کے لیے ارکان کی فضول بھرتی نہیں کرنی ہے۔ ہمیں وہ فربہی مطلوب نہیں ہے جو جسم کو طاقت ور بنانے کے بجائے الٹا بوجھل بنا دے' ہمیں صرف ان لوگوں کی ضرورت ہے جنہیں فی الواقع کچھ کرنا ہو اور جو کسی خارجی دباؤ سے نہیں بلکہ ایمان کے اندرونی تقاضے سے خدا کے دین کو قائم کرنے کی سعی کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان پے در پے تصریحات کے باوجود اس قسم کے لوگ ہمارے اس نظام میں بھی داخل ہو گئے۔ (روداد' دوم' ص ۱۳ - ۱۵)

حقیقت پسندانہ روش

میرا مدعا آپ لوگوں کو صرف یہ احساس دلانا ہے کہ اپنے کام کا جائزہ لیتے وقت نہ مثبت پہلو میں مبالغہ سے کام لینا چاہیے' اور نہ منفی پہلو میں۔ بسا اوقات آدمی خود جامد ہوتا ہے' اور اپنا جمود اسے ساری جماعت میں نظر آنے لگتا ہے۔ بسا اوقات آدمی بہت زیادہ پرجوش ہوتا ہے' اور جماعت کو جب وہ اپنی توقعات اور تمناؤں کے مطابق تیز رفتار نہیں پاتا تو کہتا ہے کہ اس پر جمود طاری ہے۔ بسا اوقات ایک شخص اپنے ذہن میں کام کا کوئی خاص نقشہ یا تصوّر رکھتا ہے' اور جب جماعت اس نقشے یا تصوّر پر کام کرتی نظر نہیں آتی تو وہ خیال کرتا ہے کہ جماعت کوئی کام نہیں کر رہی ہے۔ (تصریحات' ص ۳۱۶ - ۳۱۷' اجتماعِ ارکان لاہور' ۱۹۷۵)

معیار اور اطمینانِ کامل

میرے علم میں ایسا کوئی طریقِ تربیت اب تک نہیں آیا ہے جو معیارِ مطلوب کے آدمی تیار کرنے کی سو فی صدی ضمانت دیتا ہو۔ اس کی آپ جتنی چاہیں کوشش کر دیکھیں' ہر جائزہ آپ کو یہی رپورٹ دے گا کہ آپ کے درمیان ایک ناقابلِ اطمینان عنصر موجود ہے۔ بلکہ بحیثیتِ مجموعی پوری جماعت کے متعلق بھی ہر پہلو سے کامل اطمینان کی رپورٹ شاید آپ کبھی نہ پا سکیں گے۔ ("آئندہ لائحہ عمل" ص ۱۷۷)

بگاڑ اور سیاسی کام

[بعض لوگوں] کے نزدیک جماعت کی دینی و اخلاقی حالت گر گئی ہے' اس لیے ضرورت ہے

کہ پہلے سیاسی جدوجہد سے ہٹ کر کارکنوں کے اخلاق بنائے جائیں' پھر اس میدان میں واپس آیا جائے۔

اس کے متعلق میں یہ عرض کروں گا کہ اگر ساری جماعت بحیثیتِ مجموعی بگڑ گئی ہے تو اسے توڑ دیجیے' کیونکہ ہم بگاڑ کو سنوارنے کے لیے اٹھے تھے' بگڑی ہوئی جماعتوں میں ایک اور جماعت کا اضافہ کرنے کے لیے نہیں اٹھے تھے۔ لیکن اگر پورے مجموعے پر یہ ہمہ گیر حکم محض مبالغہ ہے' اور امرِواقعی صرف اس قدر ہے کہ جماعت میں کچھ افراد معیار سے گرے ہوئے پائے جاتے ہیں' تو اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ سارا قافلہ ان چند افراد کی خاطر رک کر کھڑا ہو جائے' اور جب تک وہ درست نہ ہوجائیں' آگے کا سفر ملتوی رہے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۷۴ - ۱۷۵)

اگر اس پروگرام کے سیاسی جز3 کو معطل کرنا اس لیے ناگزیر ہوگیا ہے کہ جماعت میں کچھ عناصر دینی و اخلاقی حیثیت سے گر گئے ہیں تو اس سے زیادہ ناگزیر یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ اور توسیعِ جماعت کے کام کو بھی معطل کر دیا جائے' کیونکہ گری ہوئی دینی و اخلاقی حالت کے ساتھ دعوت الی اللہ کیسی' اور معاشرے کی اصلاح کے کیا معنی' اور صالح افراد کی تلاش و تنظیم کا کیا موقع؟ اس دلیل سے تو جماعت کا پروگرام اب صرف اپنے موجودہ ارکان کی تربیت تک محدود رہنا چاہیے' اور یہ طے ہوجانا چاہیے کہ جب تک سارے ارکان پورے معیاری رکن نہ ہوجائیں' پبلک میں جا کر کوئی دعوتی یا اصلاحی یا سیاسی کام نہ کیا جائے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۷۶ - ۱۷۷)

صحیح سوچ اور روش

کتابی شخصیتیں واقعی شخصیتوں سے اچھی خاصی مختلف ہوتی ہیں۔ ایک گزرے ہوئے زمانے کے جو نقشے صفحۂ قرطاس پر کھینچے جاتے ہیں' گوشت پوست کی دنیا میں بعینہٖ وہ نقشے کبھی پیدا نہیں کیے جاسکتے۔ لہٰذا جس شخص کو خیالی دنیا میں نہ رہنا ہو بلکہ واقعی دنیا میں کچھ کرنا ہو اسے اس خیالِ خام میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ گوشت پوست کے انسان کبھی بشری کمزوریوں سے بالکل منزہ اور تمام مثالی کمالات کا مرقع بن سکیں گے۔

آپ حدِ کمال کو نگاہوں سے اوجھل تو نہ ہونے دیں' اور اس تک خود پہنچنے اور دوسروں کو پہنچانے کی کوشش بھی جاری رکھیں' مگر جب عملاً خدا کی راہ میں کام کرنا اور ہزار ہا آدمیوں سے کام لینا ہو تو قرآن و سنت کے مطابق دین کے تقاضوں اور مطالبات کی حدِّ اوسط آپ کو نگاہ میں رکھنی پڑے گی جس پر آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا قائم ہوجانا راہِ خدا میں کام کرنے کے لیے

کافی ہو' اور جس سے نیچے گر جانا قابلِ برداشت نہ ہو۔ یہ حدِّ اوسط خود ساختہ نہ ہونی چاہیے' اس کا ماخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت ہی ہونی چاہیے۔ لیکن بہرحال اس کو حد سمجھنا اور نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی عملی کام آدمی نہیں کرسکتا۔

صدرِ اوّل میں جن لوگوں سے خدا کا کام لیا گیا تھا وہ سب بھی نہ یکساں تھے اور نہ ان میں سے کوئی بشری کمزوریوں سے مبرّا تھا۔ آج بھی جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کام ہوگا وہ ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک نہ ہوں گے۔ یہ خوبی نظامِ جماعت میں ہونی چاہیے کہ وہ مجموعی طور پر ایک صالح اور حکیمانہ نظام ہو اور اس کے اندر یہ استعداد بھی موجود ہو کہ افراد اس میں شامل ہو کر دینِ حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دیں اور ان کی کمزوریاں بروئے کار آنے کے کم سے کم مواقع پائیں۔

ان سب الجھنوں سے بچ نکلنے کے بعد پھر بھی آدمی کے دل میں یہ خلجان باقی رہ جاتا ہے کہ اپنے جن رفقاء کے ساتھ وہ اقامت دین کے لیے کام کر رہا ہے وہ معیار مطلوب سے بہت نیچے ہیں اور ان کے اندر بہت سے پہلوؤں میں ابھی بہت خامیاں پائی جاتی ہیں۔ اس خلجان سے میں نے اپنے کسی رفیق کو بھی خالی نہیں پایا ہے اور میں خود بھی اس سے خالی نہیں ہوں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر یہ خلجان ہمیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی خامیاں دور کرنے پر اکساتا ہے اور ان صحیح ذرائع و وسائل کی تلاش اور ان کے استعمال پر آمادہ کرتا ہے جن سے یہ خامیاں دور ہوں' تو مبارک ہے یہ خلجان۔ اسے گھٹنا نہیں' بلکہ بڑھنا چاہیے۔ کیوں کہ ہماری ساری اخلاقی و روحانی ترقی کا انحصار اسی خلجان کی پیدا کی ہوئی خلش پر ہے۔ جس روز یہ مٹا اور ہم اپنی جگہ مطمئن ہوگئے کہ جو کچھ ہمیں بننا چاہیے تھا وہ ہم بن چکے' اسی روز ہماری ترقی بند ہو جائے گی' اور ہمارا تنزل شروع ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہ خلجان ہمیں مایوسی اور فرار پر آمادہ کرتا ہو تو یہ خلجان نہیں وسوسۂ شیطان ہے۔ جب بھی اس کی کھٹک محسوس ہو لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھیے اور اپنے کام میں لگ جائیے۔

اگر آپ واقعی خدا کا کام کرنے اٹھے ہیں تو خوب سمجھ لیجیے کہ ایسے وساوس سے اپنے دل کو فارغ کیے بغیر آپ کچھ نہ کرسکیں گے۔ اس وقت شیطان کے لیے اس سے زیادہ مرغوب کوئی کام نہیں ہے کہ آپ کے سامنے جماعتِ اسلامی کی ہر خوبی کو بے قدر اور بے وزن کرکے پیش کرے۔ اور اس کی یا اس کے افراد کی ہر کمزوری کو بڑھا چڑھا کر دکھائے تاکہ آپ کسی نہ کسی طرح دل چھوڑ بیٹھیں۔ (رسائل و مسائل' دوم' ص ۵۶۳ - ۵۶۵ - ترجمان القرآن' نومبر ۱۹۵۱)

انتخابات

واحد طریقہ، انتخابات

تین حقیقتیں واضح طور پر آپ کی نگاہ میں رہنی چاہئیں:
پہلی یہ کہ آپ اس ملک میں اسلامی نظام زندگی عملاً قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لیے قیادت کی تبدیلی ناگزیر ہے۔
دوسری یہ کہ آپ جس ملک میں کام کر رہے ہیں وہاں ایک آئینی و جمہوری نظام قائم ہے اور اس نظام میں قیادت کی تبدیلی کا ایک ہی آئینی راستہ ہے ---- انتخابات۔
تیسری یہ کہ ایک آئینی و جمہوری نظام میں رہتے ہوئے تبدیلی قیادت کے لیے کوئی غیر آئینی راستہ اختیار کرنا شرعاً" آپ کے لیے جائز نہیں ہے، اور اس بنا پر آپ کی جماعت کے دستور نے آپ کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ آپ اپنے پیش نظر اصلاح و انقلاب کے لیے آئینی و جمہوری طریقوں ہی سے کام کریں۔
ان تین حقیقتوں کو ملا کر جب آپ غور کریں گے تو بالکل منطقی طور پر نتیجہ وہی نکلے گا جو قرار داد [ماچھی گوٹھ] میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ انتخابات میں آج حصہ لیں، دس، بیس، پچاس برس بعد، بہرحال اگر آپ کو یہاں کبھی اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنا ہے تو راستہ آپ کو انتخابات ہی کا اختیار کرنا پڑے گا۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۲۰۵ - ۲۰۶)

انتخابات کے علاوہ جمہوری طریقے

بکثرت لوگ اس الجھن میں پڑ گئے ہیں، کہ آیا جمہوری طریقوں سے یہاں کوئی تبدیلی لائی جاسکتی ہے یا نہیں، اور ایک اچھی خاصی تعداد یہ سمجھنے لگی ہے کہ ایسے حالات میں غیر جمہوری طریقے اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ ... لیکن ہم اپنی اس رائے پر قائم ہیں کہ اسلامی نظام، جسے برپا کرنے کے لیے ہم اٹھے ہیں، جمہوری طریقوں کے سوا کسی دوسری صورت سے برپا نہیں ہو سکتا، اور اگر کسی دوسرے طریقے سے برپا کیا بھی جاسکے تو وہ دیرپا نہیں ہو سکتا۔
... آپ جمہوری طریقوں کا مطلب واضح طور پر جان لیں۔ غیر جمہوری طریقوں کے مقابلے میں جب جمہوری طریقوں کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ نظامِ زندگی میں جو تبدیلی بھی لانا، اور ایک نظام کی جگہ جو نظام بھی قائم کرنا مطلوب ہو، اسے زور زبردستی سے لوگوں پر مسلط نہ کیا جائے، بلکہ عامتہ الناس کو سمجھا کر اور اچھی طرح مطمئن کر کے

انھیں ہم خیال بنایا جائے اور ان کی تائید سے اپنا مطلوبہ نظام قائم کیا جائے۔

اس کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ عوام کو اپنا ہم خیال بنا لینے کے بعد غلط نظام کو صحیح نظام سے بدلنے کے لیے ہر حال میں صرف انتخاب ہی پر انحصار کرلیا جائے۔ . . . جہاں انتخابات کے راستے سے تبدیلی کا آنا غیر ممکن بنا دیا گیا ہو، وہاں جباروں کو ہٹانے کے لیے رائے عامہ کا دباؤ دوسرے طریقوں سے ڈالا جاسکتا ہے۔ . . . غیر مقبول نظام کو عوامی دباؤ سے بدلنا قطعاً" غیر جمہوری نہیں ہے۔(تصریحات، ص ۳۲۰ - ۳۲۱، اجتماعِ ارکان لاہور، ۱۹۷۵)

بالواسطہ انتخابات

انتخابات میں بلا واسطہ کے ساتھ بالواسطہ حصہ لینے کا مطلب کیا ہے، اور وہ کیا مصالح ہیں جن کی بنا پر یہ دوسرا طریقہ بھی اس پالیسی میں شامل کیا گیا ہے ؟

جہاں تک بالواسطہ کے مفہوم کا تعلق ہے، اس میں بجائے خود کوئی پیچیدگی نہیں ہے ۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم براہِ راست اپنے اہتمام سے کچھ لوگوں کو بھیجنے کے ساتھ ایسے عناصر کو بھی کامیاب کرانے کی کوشش کریں گے جو اسلامی نظام کے مقصد میں ہم سے متفق ہیں اور جن سے ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ اس کے قیام کی کوشش میں مددگار بن سکیں گے۔ لیکن اصل پیچیدگی ان مصالح کو سمجھنے میں پیش آتی ہے جن کی بنا پر ہم اپنی پالیسی میں اس چیز کو شامل کر رہے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں ان حالات پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے جن میں ہم کو یہ دشوار گزار گھاٹی طے کرنی ہے۔

حالات کا ایک رخ یہ ہے کہ نئے دستور کی رو سے سارے ملک کی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کی ۹ سو سے کچھ زیادہ نشستیں ہیں، جن پر بیک وقت انتخابی مقابلہ درپیش ہوگا۔ ہمارے پاس اس وقت اتنے ذرائع موجود نہیں ہیں کہ ہم ان تمام نشستوں پر، یا ان کی اکثریت پر بلاواسطہ مقابلہ کرسکیں۔ صرف اس کے مصارف ہی کا آپ اندازہ کریں تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ یہ کام ہمارے لیے کس قدر مشکل ہے۔

دوسرا رخ یہ ہے کہ جماعت کے اثرات سارے ملک میں یکساں نہیں ہیں۔ کچھ حلقے ایسے ہیں جن میں ہم اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ براہ راست خود اپنے انتخابی نظام کے تجویز کردہ آدمیوں کو کامیاب کرا لینا ہمارے لیے ممکن ہے۔ لیکن بہت سے حلقے ایسے بھی ہیں جن میں ہماری طاقت اس پیمانے کی تو نہیں ہے، البتہ اتنی ضرور ہے کہ ہماری تائید کسی اچھے اور مفید آدمی کی کامیابی

کے لیے ' اور ہماری مخالفت کسی برے آدمی کو روکنے کے لیے موثر ہو سکتی ہے۔ ایسے حلقوں میں اپنی اس طاقت کو معطل رکھنا اور اسے کسی مصرف میں نہ لانا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔

تیسرا رخ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جماعتِ اسلامی سے باہر بھی ایسے گروہ اور افراد موجود ہیں جو لادینی کے مخالف اور دینی نظام کے حامی ہیں۔ ہماری پہلے بھی یہ خواہش اور کوشش رہی ہے' اور اب بھی یہ ہونی چاہیے کہ لادینی کی حامی طاقتوں کے مقابلہ میں ان تمام عناصر کے درمیان اتفاق اور باہمی تعاون ہو' اور ان کی قوتیں ایک دوسرے کی مزاحمت میں صرف ہو کر مخالف دین عناصر کے لیے مددگار نہ بنیں۔ یہی کوشش ہمیں آئندہ انتخابات میں بھی کرنی ہے تاکہ آئندہ اسمبلیوں میں اسلامی نقطہ نظر کی وکالت کرنے کے لیے ہماری پارلیمنٹری پارٹی تنہا نہ ہو بلکہ ایک اچھی خاصی تعداد دوسرے ایسے لوگوں کی بھی موجود رہے جو اس خدمت میں اس کا ساتھ دینے والے ہوں۔ اس لیے ہم دل سے یہ چاہیں گے کہ جن حلقوں میں ہم براہ راست انتخابی مقابلہ نہیں کر رہے ہیں وہاں ہماری طاقت بے کار ضائع ہونے کے بجائے کسی حامی دین گروہ یا فرد کے حق میں استعمال ہو۔ بلکہ ہم اس حد تک بھی بڑھ جائیں گے کہ جہاں ایسا کوئی گروہ یا فرد نہیں اٹھ رہا ہے وہاں کسی نیک اور موزوں آدمی کو خود اٹھنے کا مشورہ دیں اور اپنی تائید سے اس کو کامیاب کرانے کی کوشش کریں' بشرطیکہ اس کے اپنے اثرات بھی اس کے حلقے میں کافی ہوں' اور اس کی انتخابی جدوجہد کا سارا بار ہم پر نہ آ پڑے۔

حالات کے ان تینوں پہلوؤں کو نگاہ میں رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو آپ کو پوری طرح اطمینان ہو جائے گا کہ اس قرارداد کی تجویز کردہ انتخابی پالیسی میں بلاواسطہ کے ساتھ بالواسطہ کی گنجائش ٹھیک رکھی گئی ہے۔ یہ دراصل ایک خلا تھا جو ہماری سابق پالیسی میں پایا جاتا تھا۔ تجربے' اور حالات کے مشاہدے نے ہم کو یہ احساس دلایا کہ اس کو بھرنا حکمت کا تقاضا ہے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۲۳۲ - ۲۳۵)

وسیع پالیسی

رہی یہ بات کہ آپ انتخابات میں کس طرح حصہ لیں' تو اس کے لیے ایک وسیع پالیسی بنا کر مجلس شوریٰ کو دے دیجیے' اور اس کی تفصیلات اس اجتماع عام میں طے کر کے اپنے ہاتھ نہ باندھ لیجیے۔ کیونکہ جتنے جزئیات کا فیصلہ کر کے آپ چلے جائیں گے انہیں بدلنے کی اگر کبھی ضرورت پیش آ گئی تو پھر اجتماعِ عام ہی بلانا پڑے گا اور آپ جانتے ہیں کہ بات بات پر اتنا بڑا اجتماع منعقد کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۲۳۷)

حکمتِ عملی کے اصول

تبدیلی، جمود، اور زائد از شریعت پابندیاں

میرے نزدیک کوئی گروہ، اسی زمانے میں نہیں کسی زمانے میں بھی، جاہلیت سے لڑ کر اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ تجربات سے سبق سیکھ کر، اور حالات کو سمجھ کر، اپنی پالیسیوں میں ایسا ردّ و بدل نہ کرتا رہے جس کی حدودِ شرع کے اندر گنجائش ہو۔ آپ کو اگر فی الواقع یہ کام کرنا ہے اور صرف تبلیغ کا فرض انجام دے کر نہیں رہ جانا ہے تو اپنے اوپر ان پابندیوں کو کافی سمجھیے جو خدا اور رسولؐ کی شریعت نے آپ پر عائد کی ہیں اور اپنی طرف سے کچھ زائد پابندیاں عائد نہ کر لیجیے۔ شریعت پالیسی کے جن تغیرات کی وسعت عطا کرتی ہو، اور عملی ضروریات جن کی متقاضی بھی ہوں، ان سے صرف اس بنا پر اجتناب کرنا کہ پہلے ہم اس سے مختلف کوئی پالیسی بنا چکے ہیں، ایک بے جا جمود ہے۔ اس جمود کو اختیار کر کے آپ "اصول پرستی" کا فخر کرنا چاہیں تو کر لیں، مگر یہ حصول مقصد کی راہ میں چٹان بن کر کھڑا ہو جائے گا، اور اس چٹان کو کھڑا کرنے کے آپ خود ذمہ دار ہوں گے، کیونکہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسے کھڑا نہیں کیا ہے۔ (آئندہ لائحہ عمل، ص ۲۳۵ - ۲۳۶)

اصول و مقصد اور حالات کے تقاضے

"پاکستان کے موجودہ حالات میں، عوام کے رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے" ہماری سیاسی پالیسی کیا ہونی چاہیے، میں اس کا ایک اصولی جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں، تاکہ ہمارے رفقاء کسی غلط طرزِ فکر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہم جس ملک میں، جس قوم میں، جس زمانے میں، اور جن حالات میں کام کر رہے ہیں، ہمیں کوئی پروگرام بناتے ہوئے ان سب کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ لیکن ہماری اصولی دعوت لازماً" ایک ہی رہے گی، ہمارا بنیادی مقصد بھی قطعاً" ناقابلِ تغیر ہوگا، اور اپنا عملی پروگرام بناتے ہوئے ہم ان چیزوں کو صرف اس حیثیت سے ملحوظ رکھیں گے کہ اس ملک میں، اس زمانے کے حالات میں، ہم اپنی دعوت کو کس طریقے سے فروغ دیں، اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس قوم کے اچھے رجحانات سے کس طرح فائدہ اٹھائیں، اور اس کے برے رجحانات کو کس طرح بدلیں کہ وہ ہمارے مقصد کی راہ میں کم از کم رکاوٹ تو نہ بن سکیں۔ اس نقطہ نظر سے ان چیزوں کو ملحوظ رکھنا تو عین تقاضائے حکمت ہے، لیکن اگر ہم زمان و مکان کے حالات اور لوگوں کے رجحانات کو دیکھ کر اپنی دعوت اور اپنے مقصد ہی پر نظرِ ثانی

کرنے بیٹھ جائیں تو یہ سراسر گمراہی ہے جس کا خیال تک ہمارے ذہن میں نہ آنا چاہیے۔

طریق کار حالات کے لحاظ سے بدلا جاسکتا ہے۔ حکمت عملی میں لوگوں کے اچھے یا برے رجحانات کے لحاظ سے تغیر کیا جاسکتا ہے۔ مگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور اس کی دعوت کے جو اصول مقرر کر دیے ہیں' ان میں ذرہ برابر کوئی ردّ و بدل لوگوں کے رجحانات یا زمانے کے حالات کو دیکھ کر نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ اور اس کے رسولؐ نے جس چیز کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے' ہمیں ہر حال میں اسی کو قائم کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم جس ملک میں کام کر رہے ہوں' اس کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ہم اس مقصد کے لیے سعی و جہد کے ایک طریقے کو موزوں پاکر اختیار کرلیں اور دوسرے طریقے کو ناموزوں سمجھ کر ترک کردیں۔ اسی طرح جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسولؐ مٹانا چاہتے ہیں ان کو مٹانا ہی ہماری کوششوں کا ہمیشہ مقصود رہے گا' یہ اور بات ہے کہ ہم اپنی استطاعت اور ملک کے حالات' اور عوام کی مزاجی کیفیات کو دیکھ کر یہ طے کریں کہ کن چیزوں کو مٹانے کی کوشش مقدم اور کن کے مٹانے کی کوشش مؤخر رکھی جانی چاہیے۔ نیز یہ کہ اس غرض کے لیے ہم کونسی تدابیر اختیار کرسکتے ہیں اور کن تدابیر کا اختیار کرنا غیر ممکن' غیر مفید' یا غیر مناسب ہے۔ (تصریحات' ص ۳۰۴ - ۳۰۵' اجتماع ارکان لاہور' ۱۹۷۵)

جو بات ہم یقین سے سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی مصنوعی ذریعے سے اگر کوئی ایسا انقلاب برپا کر دیا جائے جس کے لیے معاشرہ ذہنی و اخلاقی حیثیت سے تیار نہ ہو تو وہ انقلاب کبھی پائیدار نہیں ہوسکتا اور معاشرے کو تیار کرنا ایک محنت طلب کام ہے۔ . . . جب معاشرے کو ایک حد تک تیار کرلیا جائے' اس کے بعد انقلاب برپا کرنے کے لیے ہر وہ تدبیر کی جاسکتی ہے جو جائز بھی ہو' اور ان حالات میں کارگر بھی ہو جن میں ہم کام کر رہے ہیں۔ اپنے وقت اور اپنے ملک کے حالات کو نظر انداز کرکے کوئی سکیم نہیں بنائی جاسکتی' اور اگر بنائی جائے تو یہ ناکامی پر منتج ہوگی۔ (تصریحات' ص ۳۱۰)

اسلامی تحریک کے لیے ساری دنیا میں کوئی ایک لگا بندھا طریق کار نہیں ہوسکتا۔ مختلف ممالک کے حالات مختلف ہیں' اور ہر جگہ کام کرنے والوں کو اپنے حالات کے مطابق ایک طریق کار اختیار کرنا ہوگا۔ البتہ جو چیز مشترک رہے گی وہ اصول اور مقصد ہے جس کا منبع قرآن و سنت ہے۔ . . .

جو گروہ جس ملک اور معاشرے میں اس تحریک کے لیے کام کرنے اٹھے' اس کا یہ فرض ہے

کہ اعتقاد اور عمل میں کتاب و سنت کی تعلیمات کا پورا اتباع کرے' اور اقامتِ دین کو اپنا مقصود بنا کر اپنی تمام مساعی اس پر مرکوز رکھے۔ اس کے بعد اپنی تحریک کے لیے عملی پروگرام طے کرنا ہر علاقے کے لوگوں کا اپنا کام ہے' اور ان میں اتنی حکمت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی قوت' ذرائع اور حالات کے لحاظ سے اقامت دین کے لیے مناسب ترین طریق کار تجویز کریں۔ (تصریحات' ص ۱۸۴ - ۱۸۵' انٹرویو ۱۹۶۸)

حکمت کا تقاضا

حکمت یہ ہے کہ آپ بس ایک ہی لگی بندھی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے کے عادی نہ ہوں' بلکہ آپ میں یہ صلاحیت ہو کہ ایک راستہ بند ہوتے ہی دس دوسرے راستے بروقت نکال لیں۔ جس شخص میں حکمت نہیں ہوتی وہ ایک راہ کو بند پا کر بیٹھ جاتا ہے' اور اس کے ساتھ اگر وہ بے صبر بھی ہو تو پھر یا تو اس رکاوٹ سے اپنا سر پھوڑ لیتا ہے یا رہروی سے ہی باز آجاتا ہے' مگر جسے اللہ نے حکمت اور صبر دونوں سے نوازا ہو وہ جوئے رواں کی طرح ہوتا ہے جس کی منزل کوئی چیز بھی کھوٹی نہیں کر سکتی۔ چٹانیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں اور دریا کسی اور طرف سے اپنی منزل کی طرف بہہ نکلتا ہے۔

ہمارے لیے اپنا پیغام پہنچانے اور اپنی دعوت کو پھیلانے کی بس یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ہم جلسوں میں تقریریں کریں اور ہزاروں آدمی انہیں سنیں۔ بلاشبہ یہ بھی اس کام کی ایک صورت ہے' لیکن اگر اسے ہمارے لیے بند کر دیا گیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ تین تین چار چار آدمیوں کے وفود کی شکل اختیار کر لیں اور پورے شہر لاہور میں پھیل جائیں۔ گھر گھر اور دوکان دوکان اور مسجد مسجد جائیے' فرداً فرداً لوگوں سے ملیے ایک ایک شخص کو بتایئے کہ جماعت اسلامی کیا ہے۔ ... اس تبلیغ سے جو لوگ متاثر ہوں ان کو متفقین میں شامل ہونے کی دعوت دیجیے۔
(۲۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء کو جماعت اسلامی کے کل پاکستان اجتماع عام سے خطاب)

حکمتِ عملی

ہم اپنی تحریک خلا میں نہیں چلا رہے ہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں۔ اگر ہمارا مقصد محض اعلان و اظہار حق ہوتا تو ہم ضرور صرف بے لاگ حق بات کہنے پر اکتفا کرتے۔ لیکن ہمیں چونکہ حق کو قائم بھی کرنے کی کوشش کرنی ہے اور اس کی اقامت کے لیے اسی واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہے' اس لیے ہمیں نظریات اور حکمتِ عملی کے درمیان توازن برقرار

رکھتے ہوئے چلنا پڑتا ہے۔

آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے آخری مقصود کو نہ صرف خود پیش نظر رکھیں بلکہ دنیا کو بھی اس کی طرف بلاتے اور رغبت دلاتے رہیں۔ اور حکمتِ عملی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے مقصود کی طرف بتدریج بڑھیں اور واقعات کی دنیا میں ہم کو جن حالات سے سابقہ ہے ان کو اپنے مقصد کی طرف موڑنے' اس کے لیے مفید بنانے اور مزاحمتوں کو ہٹانے کی کوشش کرتے رہیں۔

اس غرض کے لیے ہمیں اپنے آخری مقصد کے راستے میں کچھ درمیانی مقاصد اور قریب الحصول مقاصد بھی سامنے رکھنے ہوتے ہیں' تاکہ ان میں سے ایک ایک کو حاصل کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے جائیں۔ . . .

اسی طرح . . . یہاں ایک کھلی کھلی لادینی ریاست کا قائم ہوجانا ہمارے مقصد کے لیے اس سے بہت زیادہ نقصان دہ ہوتا جتنا اب اس نیم دینی نظام کا نقصان آپ کو نظر آ رہا ہے۔ بلاشبہ ہم نے پوری چیز حاصل نہیں کی ہے مگر کشمکش کے پہلے مرحلے میں ہم نے اتنا فائدہ ضرور حاصل کیا ہے کہ ریاست کو ایک قطعی لادینی ریاست بننے سے روک دیا' اور اسلام کی چند ایسی بنیادی باتیں منوالیں جن پر آگے کام کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس غلط فہمی میں نہیں ہیں کہ ہمارا مقصود حاصل ہوگیا ہے۔ ہم اس مقام پر ٹھہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ بلکہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے اسے مزید مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں اور اب ہم پیش قدمی کے لیے اس سے بہتر پوزیشن میں ہیں جو اس قریبی مقصد کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں ہماری ہوتی۔

ضروری ہے کہ میں ان دونوں باتوں کو . . . کھول کر بیان کردوں۔

ہم جس ملک اور جس آبادی میں بھی ایک قائم شدہ نظام کو تبدیل کرکے دوسرا نظام قائم کرنے کی کوشش کریں گے وہاں ایسا خلا ہم کو کبھی نہ ملے گا کہ ہم بس اطمینان سے "براہِ راست" اپنے مقصود کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ لامحالہ اس ملک کی کوئی تاریخ ہوگی۔ اس آبادی کی مجموعی طور پر اور اس کے مختلف عناصر کی انفرادی طور پر کچھ روایات ہوں گی۔ کوئی ذہنی اور اخلاقی اور نفسیاتی فضا بھی وہاں موجود ہوگی۔ ہماری طرح کچھ دوسرے دماغ اور دست و پا بھی وہاں پائے جاتے ہوں گے جو کسی اور طرح سوچنے والے اور کسی اور راستے کی طرف اس ملک اور اس آبادی کو لے چلنے کی سعی کرنے والے ہوں گے۔

ان مختلف عوامل میں سے کچھ ہمارے موافق ہوں گے تو کچھ ناموافق اور مزاحم بھی ہوں گے۔ اور قائم شدہ نظام کا کسی کم یا زیادہ مدت سے وہاں قائم ہونا خود اس بات کی دلیل ہوگا کہ یہ

عوامل ہماری موافقت میں کم اور اس کی موافقت میں زیادہ ہیں۔ علاوہ بریں یہ بات بالکل فطری اور عین متوقع ہے کہ ہمارے مقابلہ میں یہ نظام ضرور ان تمام عوامل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا جو اس کے لیے ساز گار ہیں یا بن سکتے ہیں اور ایسے تمام عوامل کو ہمارے لیے ناموافق یا کم از کم غیر مفید بنانے کی بھی سعی کرے گا جنہیں وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہمارے حق میں سازگار ہیں۔ اور وہ تمام دوسری تحریکیں بھی جو ہمارے مقصد کی مخالف ہیں یا تو قائم شدہ نظام کی حمایت کریں گی' یا پھر موجودالوقت عوامل کو حتی الامکان ہمارے خلاف استعمال کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گی۔

ان حالات میں نہ تو اس امر کا کوئی امکان ہے کہ ہم کہیں اور سے پوری تیاری کرکے آئیں اور یکایک اس نظام کو بدل ڈالیں جو ملک کے ماضی اور حال میں اپنی گہری جڑیں رکھتا ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ اسی ماحول میں رہ کر کشمکش کیے بغیر کہیں الگ بیٹھے ہوئے اتنی تیاری کرلیں کہ میدان مقابلہ میں اترتے ہی سیدھے منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں۔ اور نہ اس بات ہی کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ ہم اس کشمکش میں سے گزرتے ہوئے کسی طرح "براہ راست" اپنے مقصود تک جا پہنچیں۔ ہمیں لامحالہ واقعات کی اس دنیا میں موافق عوامل سے مدد لیتے ہوئے اور مزاحم طاقتوں سے کشمکش کرتے ہوئے بتدریج اپنا راستہ نکالنا ہوگا۔ ہر قدم جس کے لیے گنجائش نکل آئے فوراً اور بروقت اٹھا دینا ہوگا۔ دوسرے قدم کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے پورا زور لگانا پڑے گا' اور سمتِ مخالف کی دھکا پیل اگر ہمیں پیچھے دھکیلے تو اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ پہلے قدم کی جگہ پاؤں تلے سے نہ نکل جائے۔

اس کشمکش کے دوران میں جتنی ضروری بات یہ ہے کہ ہمارا آخری اور اصلی مقصود ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو' اتنی ہی ضروری یہ بات بھی ہے کہ ہم اس کی سمت میں بڑھنے کے لیے ہر درمیانی قدم کو مقصدی اہمیت دیں' جو قدم رکھا جاچکا ہے اسے زیادہ سے زیادہ مضبوط بنائیں' آگے کے قدم کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کریں' اور جونہی کہ اس کے لیے جگہ پیدا ہو اس پر فوراً قبضہ کرلیں۔ آخری مقصود پر نگاہ جمانا اگر اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا کوئی قدم غلط سمت میں نہ اٹھے' تو درمیان کے ہر قدم کو اس کے وقت پر قریبی مطمعِ نظر کی حیثیت دینا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر پیش قدمی کا امکان ہی نہیں رہتا۔ جسے صرف تمنائیں بیان کرنے پر اکتفا کرنا نہ ہو بلکہ منزلِ مقصود کی طرف واقعی چلنا بھی ہو اسے تو ہر قدم جمانے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لیے تمام ممکن الحصول موافق طاقتوں سے اس طرح کام لینا اور تمام موجود مزاحمتوں کو

ہٹانے کے لیے اس طرح لڑنا ہوگا کہ گویا اس وقت کرنے کا کام یہی ہے۔

اس معاملہ میں صرف نظریت کام نہیں دیتی بلکہ اس کے ساتھ عملی حکمت ناگزیر ہے۔ اس حکمت کو نظرانداز کردینے والا نظری آدمی طرح طرح کی باتیں کرسکتا ہے۔ کیونکہ وہ یا تو قافلے میں شامل ہی نہیں ہوتا' یا پھر قافلے کو لے کر چلنے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی۔ مگر جسے چلنا ہی نہ ہو بلکہ چلانا بھی ہو وہ ہر بات کو محض اس کے خیالی حسن کی بنیاد پر قبول نہیں کرسکتا۔ اسے تو عملی نقطۂ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہے' جو قوت اس وقت اس کے پاس موجود ہے یا فراہم ہونی ممکن ہے اور جو مزاحمتیں راستے میں موجود ہیں ان سب کو دیکھتے ہوئے کونسی بات قابلِ قبول ہے اور کونسی نہیں' اور یہ کہ کس بات کو قبول کرنے کے نتائج کیا ہوں گے۔

نظری آدمی تو بے تکلف کسی مرحلے پر بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک ایک قدم اٹھانے اور قدم قدم کی جگہ کے لیے کشمکش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ "براہِ راست" کیوں نہیں بڑھ جاتے۔ مگر کام کرنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ راستے کی مزاحم طاقتوں کے ہجوم میں سے آخر براہِ راست کیسے بڑھ جاؤں ؟ ان کے سر پر سے چھلانگ لگا کر جاؤں ؟ زمین کے نیچے سے سرنگ لگا کر جا پہنچوں ؟ یا کوئی تعویذ ایسا لاؤں کہ اسے دیکھتے ہی یہ سارا ہجوم چھٹ جائے اور میں اپنے قافلے کو لیے ہوئے سیدھا اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جاؤں ؟

نظری آدمی اس کشمکش کے دوران میں کسی جگہ بھی ٹھہر جانے یا پیچھے ہٹ جانے کا بڑے اطمینان سے مشورہ دے سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ ٹھہر کر یا پیچھے ہٹ کر تیاری کرو اور پھر اس شان سے آؤ کہ بس ایک ہی ہلّے میں سابق نظام ختم اور نیا نظام پورا کا پورا قائم ہو جائے۔ مگر کام کرنے والے کو ایسے مشورے قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مزاحم طاقتوں کی موجودگی میں کشمکش روک کر ٹھہر جانا ممکن بھی ہے یا نہیں ؟ پیچھے ہٹوں تو بیک دحلہ منزل پر پہنچنا تو درکنار اس جگہ واپس آنے کا بھی کوئی امکان باقی رہ جاتا ہے جہاں سے پہنچنے کے لیے کہا جا رہا ہے ؟ اور کیا میرے ٹھہرنے یا ہٹنے کی صورت میں مزاحم طاقتیں بھی ٹھہر یا ہٹ جائیں گی کہ وہ ماحول کو میرے لیے اور زیادہ ناسازگار بنانے سے رک جائیں اور میں اسے خوب سازگار بنا کر اور خود پوری طرح تیار ہو کر بڑے اطمینان سے ایک بھرپور حملہ کرسکوں ؟

غرض نظری آدمی کے لیے ہر قابلِ تصور تجویز لے آنا ممکن ہے کیونکہ جن تخیلات کے عالم میں وہ رہتا ہے وہاں حالات اور واقعات موجود نہیں ہوتے صرف خیالات ہی خیالات ہوتے ہیں'

مگر کام کرنے والا واقعات کی دنیا میں کام کرتا ہے اور اس پر کام چلانے کی ذمّہ داری ہوتی ہے' اس لیے وہ عملی مسائل کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کرسکتا۔

ایک اور حیثیت سے بھی نظریت اور حکمتِ عملی میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھنا اس شخص کے لیے ضروری ہے جو واقعات کی دنیا میں عملاً اپنے نصب العین تک پہنچنا چاہتا ہو۔ آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے نصب العین کی انتہائی منزل سے کم کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے' اور جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے ان پر سختی کے ساتھ جما رہے۔ مگر واقعات کی دنیا میں یہ بات جوں کی توں کبھی نہیں چل سکتی۔ یہاں نصب العین تک پہنچنے کا انحصار ایک طرف ان ذرائع پر ہے جو کام کرنے والے کو بہم پہنچیں' دوسری طرف ان مواقع پر ہے جو اسے کام کرنے کے لیے حاصل ہوں۔ اور تیسری طرف موافق اور ناموافق حالات کے اس گھٹتے بڑھتے تناسب پر ہے جس سے مختلف مراحل میں اسے سابقہ پیش آئے۔ یہ تینوں چیزیں مشکل ہی سے کسی کو بالکل ساز گار مل سکتی ہیں ۔ کم از کم اہلِ حق کو تو یہ کبھی ساز گار نہیں ملی ہیں اور نہ آج ملنے کے کوئی آثار ہیں۔

اس صورتِ حال میں جو شخص یہ چاہے کہ پہلا قدم آخری منزل ہی پر رکھوں گا' اور پھر دورانِ سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثناء اور کسی لچک کی گنجائش بھی نہ رکھوں گا' وہ عملاً اس مقصد کے لیے کوئی کام نہیں کرسکتا۔ یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمتِ عملی کا ملنا ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے راستے کی کن چیزوں کو آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیے' کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے' کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہیے اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسبِ ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیے۔ (رسائل و مسائل' چہارم' ص ۳۰۵ ـ ۳۲۲)

اسلامی تحریک کے مراحل دورِ حاضر میں

نعیم صدیقی

چھٹی صدی ہجری تک دین و سیاست کے درمیان جو آویزش بپا رہی تھی' اس نے ایک فیصلہ کن انجام پر پہنچنے کے بعد دین کو زندگی سے الگ ہٹا کر جامد مذہبیت کے سانچے میں ڈھلنے پر مجبور کردیا۔ . . . جامد مذہبیت کے فروغ پانے کے بعد مسلمان کے ذہن سے یہ بات بالکل نکل ہی گئی کہ اسلام کی دعوت میں کوئی انقلابی پہلو بھی پایا جاتا ہے اور اس کا طریق کار ایک بڑھنے اور پھیلنے والی تحریک کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ شعور بالکل ختم ہوگیا کہ اسلام نظامِ سیاست و تمدن کو اپنے نقشے پر ڈھالنا چاہتا ہے' اور اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے وہ قیادت و اقتدار کی باگ ڈور پر بلا شرکت غیرے مکمل قبضہ چاہتا ہے۔ بخلاف اس کے اسلام کے سرپرستوں نے اسلام کو نظامِ کفر کے سایے میں ایک پرامن اور وفادار خادم کے مقام پر گرانے کی کوشش کی اور اسے ہر قسم کے ماحول میں "بے ضرر" دھرم بنا کر رکھنے کے لیے اپنی قوتیں صرف کردیں۔

اس طرح جب "تحریکیت" کے بجائے اسلام میں جامد مذہبیت کے انداز پیدا کردیے گئے تو پھر دین کی دعوت' دینی نظمِ جماعت' دینی تحریک' دینی مقاصد' دینی طریقِ کار وغیرہ کے مفہوم میں بھی جمود سرایت کرگیا اور دینداری اور جمود باہم لازم و ملزوم ہوگئے۔ جن حضرات نے ایک طویل مدت کے بعد یہ صورتِ حالات پیدا کی ہے ان کے سامنے اسلام کا ایک ایسی تحریک بن کے ابھرنا جو قوت کی باگ ڈور سنبھال کر زندگی کی ساری کارگاہ کو نئے انداز سے منظم کرنا چاہتی ہے' ایک ایسی انوکھی صورتِ حالات ہے' جس سے وہ خواہ مخواہ اُبراتے ہیں اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ حرکت و عمل کا یہ سارا طوفان ایک ہنگامۂ دنیویت ہے' اس میں دین کی اصل روح کارفرما ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ اس نشوونما پاتی ہوئی تحریک پر جب نگاہ ڈالتے ہیں تو اپنی آنکھوں پر

ان ہی چند خاص اصطلاحات کی رنگین عینکیں لگا کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں جو جامد مذہبیت کے تنگ تصورات کی حامل ہیں۔ ان تنگ تصورات کے تنگ پیمانوں سے جب وہ جماعتِ اسلامی کی سرگرمیوں کو ماپنا چاہتے ہیں تو یہ پیمانے چھلک جاتے ہیں اور وہ زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ ۔

تو اسے پیمانہ، امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں ' پیہم رواں' ہر دم جواں ہے زندگی

... اس طرح کے محدود ذہنی تصورات کو ذہنوں میں جگہ دے کر یہ سمجھنا آدمی کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ ایک نشوونما پاتی ہوئی تحریک کس طرح چلا کرتی ہے' اسے ہر ہر قدم پر کس طرح نو بہ نو مراحل پیش آتے ہیں اور وہ انہیں کن کن طریقوں سے حل کرتی ہوئی آگے بڑھا کرتی ہے۔ ... اسلام کے تحریکی مزاج کو اگر سمجھ لیا جائے تو پھر اس حقیقت کا فہم کچھ بھی مشکل نہیں رہتا کہ دین کی علمبرداری کرنے والے کسی کارواں کا راستہ کن کن وادیوں سے ہوتا ہوا اور کون کون سے موڑ مڑتا ہوا آخری نصب العین تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا اب ضروری ہے کہ ... [ہم] اسلام کی راہِ عمل اور اس کے مراحلِ کار کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی تحریکی فطرت کو پیش نظر رکھیں۔

جامد مذہبیت نے دعوتِ دین کی اصطلاح کو مروجہ تبلیغ کا محدود مفہوم دے کر جس سطح پر گرا دیا ہے' وہ اسلام کے تصورِ دعوت و تبلیغ سے بہت ہی پست ہے۔ بخلاف اس کے جماعتِ اسلامی "دعوت" کی اصطلاح کو اس کے جامع مفہوم کے ساتھ اپنے پیشِ نظر رکھتی ہے۔ ہمارے سامنے صرف چند مابعدالطبیعی عقاید اور فقہی جزئیات پر وعظ کہنے اور انفرادی گفتگوئیں کرلینے کا پروگرام نہیں ہے' بلکہ ہماری دعوت اقامتِ دین کی دعوت ہے' ہم ایک غلط نظامِ زندگی کو اسلامی نظامِ زندگی میں بدلنے کے داعی ہیں۔ ہماری دعوت کا خطاب صرف افراد ہی سے نہیں' بلکہ معاشرے کے مجموعی وجود اور تمدن و سیاست کے ہمہ گیر اداروں سے بھی ہے۔ ... کبھی یہ دعوت ناصحانہ پیرائے میں دینی پڑتی ہے اور کسی موقع پر ناقدانہ پیرائے میں' کبھی اس کے لیے نرم سے نرم انداز ڈھونڈ کے لانا پڑتا ہے اور کبھی یہ تقاضا کرتی ہے کہ گرم سے گرم پیرایۂ بیان اختیار کیا جائے۔ ... پھر یہ پہلے قدم پر جو کچھ ہوتی ہے' دوسرے قدم پر اس سے زیادہ وسعت اختیار کرلیتی ہے۔ پھر تیسرے قدم پر کسی انداز میں اور زیادہ زور دار ہمہ گیری کے ساتھ نمودار ہوتی ہے --- یہاں تک کہ پورے معاشرہ پر چھا جائے۔ یہ دعوت لڑاتی بھی ہے' اور صلح بھی کراتی ہے' یہ توڑتی بھی ہے اور جوڑتی بھی ہے' اور مختلف احوال و شیئون سے گزرتی ہوئی اپنی تکمیل کو

پہنچتی ہے۔

اجتماعی انقلاب کی دعوت دینے والی کوئی بھی جماعت ہو۔۔۔ درحقیقت اس کا وجود ہمہ تن دعوت ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی مخالف طاقتوں پر تنقید کررہی ہو' اور اس وقت بھی دعوت ہوتا ہے جب کہ وہ برسراقتدار طاقتوں کے خلاف چارج شیٹ لے کر میدان میں آئے۔۔۔

بالکل اسی طرح جماعتِ اسلامی کا ایک اصول کی علمبردار جماعت کی حیثیت سے موجود ہونا' اور مختلف سرگرمیوں میں اس اصول کا مظاہرہ کرنا' تمام تر دعوتِ دین ہے۔ اس کا لٹریچر' اس کے ہینڈ بل' اس کے پوسٹر' اس کے جلسے' اس کے ریزولیوشن' اس کے بیانات' اس کی تنقیدیں' اس کے احتجاج' اس کے مظاہرات' اس کی پالیسی' اس کی مجلسِ شوریٰ کے فیصلے' اس کے ہفتہ وار' ماہانہ' سہ ماہی اور سالانہ اجتماعات' اس کی سوشل خدمات' اس کے کارکنوں کے ادبی حلقے' وغیرہ از سرتاپا اپنی مجموعی حیثیت سے اقامتِ دین کی دعوت ہیں۔ ایک اجتماعی انقلاب کی علمبردار جماعت کی سرگرمیوں کا مجموعہ دعوت ہوتا ہے' نہ یہ کہ دعوت اس کی سرگرمیوں کا ایک جز ہو۔

جن اصحاب پر دعوت کا یہ تصور اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ واضح نہیں ہے ان کو جماعتِ اسلامی کی بہت سی سرگرمیاں دعوت کے ماوراء بلکہ دعوت سے متضاد معلوم ہوتی ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دعوتِ دین کو پس پشت ڈال کر یا اسے ایک گونہ کمزور کرکے کچھ دوسرے سیاسی کام کیے جارہے ہیں۔ اس قسم کے حضرات جماعتِ اسلامی کی دعوت کے کسی نئے مرحلے میں داخل ہونے پر بہت اُبراتے ہیں کہ یہ کیا ہونے لگا۔ چنانچہ جب جماعت "مطالبۂ نظامِ اسلامی" کی ابتدائی تحریک لے کے آگے چلی تو بھی ان کو کھٹک ہوئی' پھر جب انقلابِ قیادت کی صدا بلند کی گئی تو اس وقت بھی ان کو الجھن ہوئی' پھر جب شرکتِ انتخاب کا فیصلہ کیا گیا تو بھی ان کو شکایت ہوئی کہ جماعت دین سے سیاست کی طرف لڑھک گئی ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس اب جب "اجتماعی مظاہرے" کا نیا مرحلہ سامنے آیا تو اس پر ان حضرات کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ کجا ۔. دین اور کجا احتجاجی مظاہرے! حالانکہ یہ سب کچھ عین جائز اور حق ہے اور یہ سب کچھ ...گر ، نہیں۔

... تک درست ہوکر اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ ذہنوں میں

خیرخواہ جماعتِ اسلامی کے بارے میں رائے قائم

...ے کہ جو دین کی دعوت

دے وہ بس دعوت ہی دے' کچھ اور نہ کرے۔ ایک داعیٔ جماعت کے لیے یہ جائز نہیں سمجھا جاتا کہ وہ اقتدار پر تنقید کرے یا اس سے کسی اجتماعی حق کا مطالبہ کرے' یا اس کے مظالم کے خلاف احتجاج کرے۔ اس نظریے کے لیے خود دین میں کوئی دلیل نہیں ہے' بلکہ درحقیقت یہ بھی ایک نتیجہ ہے جامد مذہبیت سے متاثر چلے آنے کا۔ (معروف و منکر' ص ۱۳۶ - ۱۴۱)

...

پس دعوت کے غلط تصور اور تبلیغ کے غلط ذوق کی عینک سے اگر جائزہ لیا جائے تو پھر نتیجہ یہی ہوگا کہ وعظ و تلقین کے علاوہ جو کچھ بھی ایک تحریک سے صادر ہو وہ اس کی داعیانہ حیثیت کے منافی قرار پائے۔

درحقیقت یہ بات پلے باندھ لینے کی ہے کہ دعوتِ دین کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے نفاذ کو برپا کرنے کے لیے جتنے لوازم درکار ہوں' ان کو فراہم کیا جائے اور جتنی رکاوٹیں حائل ہوں ان کو راستے سے ہٹا دیا جائے' ان دونوں مقاصد کے لیے جائز حدود میں جو جو کچھ بھی اقدام کیے جائیں گے وہ سب دعوت دین کی تعریف میں داخل ہوں گے۔ ان میں سے کسی کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اقدام دعوت کو پس پشت ڈالنے والا ہے۔

یہ ہے صحیح تصور دعوت' اور اس تصور دعوت کے ساتھ کام کرنے والی جماعتوں اور تحریکوں کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔(ایضاً ص ۱۴۳ - ۱۴۴)

...

جہاں تک تنقید --- اور بالخصوص وقت کی قیادت پر تنقید کا تعلق ہے' یہ ہمیشہ دعوتِ اقامتِ دین کا ایک جز رہی ہے۔۔۔اس کا واضح اور جامع نمونہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں ملے گا کہ آپؐ کی زبان سے جو الہامی خطبے نشر ہوئے تھے ان میں قریشِ مکہ کی معاشرتی لیڈر شپ' متولیانِ کعبہ کی مذہبی قیادت' شعرا و خطبائے قریش کی فکری و ادبی پیشوائی' سود خورانِ مکہ کی معاشی سربراہ کاری' کاہنوں اور نجومیوں کے عالمِ تصوف کی عنان برداری اور اہلِ کتاب کی فقہی امامت پر انتہائی کڑی تنقیدیں موجود ہیں' بلکہ قرآن کی بعض سورتیں ان مقتدر عناصر کے خلاف کھلے کھلے چارج شیٹ لے کر نمودار ہوئی ہیں۔ اسی تنقید نے مخالفینِ تحریکِ اسلامی کے اخلاقی موقف کو کھوکھلا کیا' تب کہیں جاکر تبدیلی کے راستے ہموار ہوئے۔

علاوہ بریں آپ اگر اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صلحائے امت نے خلفاء و سلاطین پر بہت ہی بے لاگ تنقیدیں کی ہیں۔۔۔ وہ کبھی اس پر راضی نہیں ہوئے کہ محض

توحید و رسالت کے عقائد کی تلقین کردینے پر اکتفا کرلیں اور پھر یہ سمجھ بیٹھیں کہ دعوتِ دین کا حق ادا ہوگیا۔ دور نہ جایئے یہیں اپنے ملک کے اندر شاہ ولی اللہ دہلوی کے علمی کارنامۂ دعوت کا جائزہ لیجئے' اس میں آپ کو حکمرانوں اور عوام کے تمام طبقات کے متعلق انتہائی تلخ تنقیدیں ملیں گی۔۔۔

عین اسی طرح خود مطالبہ بھی تحریک اسلامی کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک طرف فرعون کے دربار میں خالص توحید کی دعوت لے کے جاتے ہیں' لیکن دوسری طرف وہی حضرت موسیٰؑ ہیں کہ **ادسل معی بنی اسرائیل** کا مطالبہ لیے ہوئے مصروف تقاضا نظر آتے ہیں' اور اس مطالبے کو منوا کے چھوڑتے ہیں۔ یہاں کوئی شخص گمان بھی کرسکتا ہے کہ خدا کے نبی نے دعوتِ دین کو پس پشت ڈال کر ایک سیاسی مطالبے کو اپنا مقصود بنا لیا تھا؟ نہیں یہ مطالبہ خود دعوتِ دین ہی کے تضمنات میں شامل تھا۔ بالکل اسی طرح دعوت کو لے کر چلتے ہوئے احتجاج اور مظاہرے کی منازل بھی آسکتی ہیں۔

...

کچھ حضرات کو خاص طور پر "احتجاج" تحریکِ اقامتِ دین کے مزاج سے ناسازگار محسوس ہوتا ہے' بدیں وجہ وہ اس بات کو لازم سمجھتے ہیں کہ ظلم کو بہرحال چپ چاپ سہنا چاہیے اور اس کے خلاف رائے عام کو تیار کرنے یا اقتدار کو اس سے باز رکھنے کے لیے کسی طرح کی جنبش نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں بھی دعویٰ بلا دلیل ہے۔

اوّل تو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اسلامی نظام کے سوا ہر نظامِ زندگی ایک مجسم و منظم ظلم ہوتا ہے اور اس ظلم کے خلاف تحریکِ اسلامی کا عین وجود ہی یکسر احتجاج ہوتا ہے۔ دوسری حقیقت یہ بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ ظلم کرنے والے کو ظلم کرنے کے لیے کھلی چھٹی دیے رکھنا دین کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔۔۔ ظالم کو ظلم کی اجازت دے دینا اور کسی قسم کے احتجاج کی طاقت رکھتے ہوئے آواز نہ اٹھانا ظلم کے فروغ میں مدد دینے کے برابر ہے۔ خود قرآن نے بدیں الفاظ ہر انسان کو حقِ احتجاج دیا ہے کہ:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء۴: ۱۴۸)

اللہ کسی کی زبان سے برائی کی پکار کو پسند نہیں کرتا' بجز اس کے جو مظلوم ہو۔

۔۔۔ فی نفسہٖ تجہج بالقول کا حق خدا کے انبیا نے بھی استعمال کیا ہے' چاہے اس کا پیرایہ کچھ ہی رہا ہو۔ مثلاً' حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے جب آزادی کے بند دروازے کھولے جانے کا فیصلہ ہوتا

ہے تو وہ اس ظلم کے خلاف احتجاج کرتے ہیں جو ان پر روا رکھا گیا تھا' چنانچہ وہ پورے معاملے کی تحقیقات کامطالبہ کرتے ہیں اور عزیزِ مصر کے سامنے یہ سوال رکھتے ہیں کہ **فما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھن** - چنانچہ آپؑ کی بے گناہی نکھر کے سامنے آجاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے احسان جتانے پر یہ احتجاجی فقرہ ارشاد فرماتے ہیں :

تِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ (الشعراء ۲۶ : ۲۲)

تیری کرم فرمائی جس کا مجھ پر تو احسان دھرتا ہے' یہی تو ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلامی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

...

پس احتجاج کو تحریکِ اسلامی سے فی نفسہٖ کوئی منافات نہیں ہے۔ ایک اسلامی تحریک کا احتجاج خود دعوت بن جاتا ہے اور اس کے ذریعے حکومت اور رائے عام دونوں کے سامنے حق واضح ہوتا ہے اور باطل کی تردید ہوتی ہے !

سوال صرف احتجاج تک محدود نہیں ہے' بلکہ دین کے بہت سے رمزشناسوں کو اصل اختلاف احتجاجی مظاہروں سے ہے۔ مظاہرہ ان حضرات کے لیے ایک غیر دینی سی کارروائی ہے' یا دنیوی سیاست کا ایک طریقِ کار ہے۔ یہ احساس بھی درحقیقت اسی بنیادی تصورِ دین و سیاست کے بگاڑ کا نتیجہ ہے۔ قابلِ غور یہ ہے کہ مظاہرے کی اصل حقیقت کیا ہے؟

...

اگر مظاہرات کا تجزیہ کرکے دیکھا جائے تو اس کی ماہیت صرف یہ ہوتی ہے کہ ایک منظم طاقت نظامِ تمدن و سیاست کے خداوندوں اور ملک کے عوام کو اپنے احساسات سے آگاہ کرتی ہے۔ ... مظاہرہ خود یکسر ایک دعوت اور ایک تبلیغ ہی ہوتا ہے وہ دعوت و تبلیغ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مظاہرہ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہنے کی ایک عملی اور اجتماعی صورت کا نام ہے۔ وہ منکر کو منکر اور معروف کو معروف کہنے کا ایک وسیع الاثر پیرایہ ہے۔ مظاہرہ صرف حکمران طاقت ہی کو خطاب نہیں کرتا' بلکہ وہ رائے عام کی تربیت کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

...

پس مظاہرہ اگر جائز حدود میں رہے تو اپنی حقیقت و ماہیت کے اعتبار سے دعوت کا ایک وسیع الاثر ذریعہ ہوتا ہے --- اور فی نفسہٖ اس میں دینداری کی کوئی نفی نہیں پائی جاتی' الّا یہ کہ اس کے لیے پیرایہ اور طریقِ کار غلط اختیار کیا جائے۔

ایک خدشہ یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کے سیاسی طور طریقوں کو اختیار کرلینے سے تعمیرِ سیرت و تقویٰ کا پروگرام کمزور ہوجائے گا۔ بلکہ ہوسکتا ہے کہ اب تک جو سرمایۂ اخلاق و کردار جمع کیا جاچکا ہے وہ بھی نقصان کا شکار ہوجائے۔ پس اگر ان سرگرمیوں کو اختیار کرنا ہی تھا تو ابھی کافی مدت تک سیاسی مصروفیات سے بچ کر داخلی تعمیر کا کام مکمل کرلینا چاہیے تھا۔

اس خدشہ کو سب سے پہلے خود جماعتِ اسلامی اور اس کے قائم کرنے والوں ہی نے پوری اہمیت کے ساتھ محسوس کیا تھا' اور اسی کے پیشِ نظر جماعت نے سات سال تک جلسوں اور مظاہروں سے اپنا دامن بچا کر پہلے وہ نئی ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کی جو ان وظائف سیاسی کو پرانی روایات سے پاک کرکے نئے انداز میں سرانجام دینے کے قابل ہو۔

...

جماعت نے ایک مدت تک ان جذباتی مظاہر کے فی نفسہٖ جائز ہونے کے باوجود ان سے اپنے کارکنوں کو [اس لیے] پرہیز کرایا ہے' تاکہ کہیں نمائش پسندی اور کھوکھلی ہنگامہ آرائی کی پرانی عادات میں پھر جان نہ پڑ جائے' لیکن جب اس پہلو سے اطمینان ہوگیا تو آہستہ آہستہ بتدریج سیاسی حرکت کے لیے مختلف ذرائع و وسائل کو بہ اندازِ نو استعمال کیا جانے لگا۔

علاوہ بریں سیاست کے خارجی مظاہر ایک عرصہ دراز سے اسلام کی حدود سے آزاد چلے آرہے تھے۔ ... جماعت نے اس بے اسلام سیاسی ہنگامہ آرائی کے ناپاک مظاہر کے خلاف ایک شدید نفرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ نفرت ماضی کے ردِّعمل کے طور پر بعض اصحاب میں حدِّ ضرورت سے زیادہ پیدا ہوگئی ہے اور وہ مظاہرِ سیاست کو اسلامی حدود کی پابندی میں محدود ہوجانے کے بعد بھی اسی طرح مکروہ اور مضر سمجھتے ہیں جس طرح وہ اس سے پہلے تھے۔

ہم نے عندالضرورت ایک حکیمانہ تدریج کے ساتھ ان تمام ذرائع و وسائل سے کام لینا شروع کردیا ہے جن کے بغیر کوئی تحریک عوامی تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتی' لیکن ان سب کو پرانی ناپاک روایات سے پاک کرکے اسلامی اصولوں کے خراد پر گھما کر از سرنو ان کی نوک پلک بنائی ہے اور مظاہرِ سیاسی کی نوعیت کو بدل دیا ہے۔ ٹھوس علمی لٹریچر کے ساتھ ہم اب پوسٹروں اور ہینڈ بلوں سے بھی کام لیتے ہیں' اپنے مخصوص اجتماعات کے ساتھ ساتھ ہم اب جلسہ ہائے عام بھی کرتے ہیں' اصولِ دین کی دعوت کے ساتھ ہم حکومت کی اصلاح کے لیے مطالبہ اور ریزولیوشن بھی سامنے لاتے ہیں' اور زبان و قلم سے اظہارِ جذبات کے پہلو بہ پہلو مظاہرات سے بھی کام لیتے ہیں --- اور آگے چل کر ہمیں دوسرے مختلف جائز طریقے بھی ذرائع و وسائل کی حیثیت سے

اختیار کرنے ہوں گے۔

لیکن ہم نے سیاست کے ذرائع و وسائل کو اسلامی حدود کا پابند بنا کر اتنا بدل دیا ہے کہ ہمارے پوسٹر' ہمارے جلسے' ہمارے بیانات' ہمارے ریزولیوشن' ہمارے مطالبے اور ہمارے مظاہرے خود تعمیرِ فکر و سیرت کے نہایت مؤثر ذرائع بن گئے ہیں' وہ سیاست جو خالص دیوی خطوط پر چلتی رہی ہے۔ اس کے مظاہر یقیناً سیرت و اخلاق کے لیے تباہ کن تھے' لیکن اب جبکہ سیاست کو دین کی شاہراہ پر ڈال دیا گیا ہے' اب یہ مظاہر خود تعمیرِ سیرت و اخلاق کے بہترین ذرائع ثابت ہو رہے ہیں۔ ہماری تمام سیاسی سرگرمیاں جماعت کے کارکنوں کے لیے بھی اور عوام الناس کے لیے بھی سنجیدگی' وقار' پابندیٔ وقت' احترامِ نظم اور اہتمامِ اخلاق کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے کا ایک قابلِ قدر سامان بنتی جارہی ہیں۔ اللہ کی اس عنایت پر ہم اس کے حد درجہ شکر گزار ہیں۔

وہ دنیا پرستانہ سیاست جس سے کنارہ کش ہوئے بغیر سیرت و تقویٰ کی تعمیر ممکن نہیں' اس کے ناپاک مظاہرے سے جیسی نفرت ہمیں کل تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔ لیکن سیاست کے اسلامی حدود میں پابند ہوجانے کے بعد بھی جو لوگ اس کے معتدل اور متوازن مظاہر کو تقویٰ کے منافی اور سیرت کے لیے مہلک سمجھتے ہوں' ان کے دل و دماغ میں یقیناً دین و سیاست کی تفریق کا نظریہ اب تک پناہ گزین ہے۔ حالانکہ وہ سیاست جس کا محور نظام اسلامی کے قیام کا نصب العین ہو اور جس کے طریق کار کا ہر پہلو اسلامی حدود اخلاق کا پابند ہو' وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک اللہ کی عبادت ہے --- اور تمام نفل عبادات سے افضل عبادت ہے۔ یہ افضل ترین عبادت صرف ایسے لوگوں کے تقویٰ کے لیے تباہ کن ہوتی ہے جو سیاست کی ذمہ داریوں کو دین سے الگ سمجھتے ہیں' لیکن جن لوگوں کے نزدیک سیاست کی ساری خدمات خود دین ہیں' وہ تو نظامِ اسلامی کے قیام کی جدّوجہد میں جو قدم بھی اٹھاتے ہیں وہی ان کے لیے تعمیرِ تقویٰ کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ جماعت کے اکثر کارکنوں کا حال یہی ہے کہ وہ جب تانگے پر بیٹھے کوئی اعلان کررہے ہوتے ہیں' دیواروں پر کوئی پوسٹر چسپاں کررہے ہوتے ہیں' کسی اجتماع میں شرکت کے لیے مصروفِ سفر ہوتے ہیں' اور اسی طرح جب وہ کسی مظاہرے میں کتبات لیے چوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں تو وہ ان ساری ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے آقا کی اطاعت و عبادت کی کیفیت محسوس کرتے ہیں۔ یہ کیفیت صرف ان قلوب کے لیے حرام کردی جاتی ہے جو اسلامی سیاست کو بھی دین سے الگ کوئی چیز شمار کرتے ہیں۔

پھر یہ امر بجائے خود قابلِ غور ہے کہ زندگی کی جنگاہ سے الگ بیٹھ کر تعمیرِ سیرت کرنے کے

لیے میدانِ کار ہے کہاں ؟ جسے پیراک بننا ہو‘ اسے بہرحال پانی کی موجوں کے اندر ہی پیرنا سیکھنا ہوگا‘ پانی سے باہر پیرنے کی کوئی تربیت گاہ اس آسمان کے نیچے کہیں موجود نہیں ہے۔ اخلاق و تقویٰ پیدا کرنے کے لیے روحانی کسرت کا کوئی مقررہ کورس نہیں ہے کہ ہنگامہ ہائے حیات سے الگ رہ کر پہلے اسے پورا کرلیا جائے اور پھر سندِ فراغت ملنے کے بعد اپنے آپ کو مختلف ذمہ داریوں میں مصروف کیا جائے۔ اخلاق و تقویٰ تو زندگی میں کرنے ہی سے پیدا ہوتا ہے‘ اور اسی حد تک پیدا ہوتا ہے جس حد تک عملی سرگرمیوں میں حصہ لیا جارہا ہو۔ خلوت میں رہیے تو خلوت ہی کا تقویٰ پیدا ہو گا‘ جلوت کا تقویٰ خلوت میں نہیں آسکتا‘ اس کے لیے تو جلوت ہی میں آنا پڑے گا۔ کاروبار کا تقویٰ صرف کاروبار کرنے کے دوران میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ مسجد میں نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ میدانِ جنگ کا تقویٰ تیغ و تفنگ کے ہنگامے میں کود پڑنے والوں کو ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ سبکسارانِ ساحل کو اس میں سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا۔ بالکل اسی طرح سیاسیات کا تقویٰ --- جو عام انفرادی سرگرمیوں کے تقویٰ سے بہت ہی بلند مرتبہ ہے --- سیاسیات سے دامن بچا کر پیدا کرنا ناممکن ہے۔ اسے جب بھی آپ پیدا کرنا چاہیں گے تو آپ کو لازماً میدانِ سیاست میں قدم رکھنا ہوگا۔ رضائے الٰہی کو اپنا مقصود بنا کر آپ حدود اللہ کی پابندی کرتے ہوئے جس سرگرمی میں بھی حصہ لیں گے وہ عین عبادت بن جائے گی اور آپ کے اندر اخلاق و تقویٰ کی تعمیر کا وسیلہ ثابت ہوگی۔

...

تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک انتہائی اہم موڑ مڑنے والی ہے اور اگر اسے غلط راستے پر جانے سے روکنے کے لیے فوراً ہی ایک منظم قوت اس کے آڑے نہ آئے تو پھر یہ دریا الحاد کے رخ بہ جانے کے بعد جب کنارے کاٹتا ہوا اپنی رودگاہ کو گہرا اور اپنے پاٹ کو چوڑا کرچکے گا تو پھر اسے ایک نئی سمت میں موڑنا دنیا کا ایک محال کام ہوگا۔

یہ اللہ کا احسان ہے کہ جماعتِ اسلامی کے رہنماؤں نے اپنے ماحول‘ اپنی حریف طاقتوں‘ اپنے دور کی تاریخ‘ اور اپنے وقت کے تقاضوں سے آنکھیں بند کرکے ”زمین جنبد نہ جنبد گل محمد“ کا ڈھنگ اختیار نہیں کیا کہ چاہے تمدن و سیاست کی ساری بازی شاطر الحاد جیت جائے لیکن وہ ایک گوشے میں بیٹھے تعمیرِ سیرت کے کام میں لگے رہیں۔ جب اسلام دشمن طاقتیں زندگی کے حرم کے دروازے توڑ کر اس پر اپنا جھنڈا لہرانے کے لیے آخری ہلّہ بول رہی ہوں تو ان لوگوں کی سیرتیں اور تقویٰ کس کام کا جو اپنی جانوں کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کیے بیٹھے

رہیں۔ جماعتِ اسلامی نے جس روز مطالبہ نظام اسلامی کی تحریک شروع کر کے عوامی دور میں قدم رکھا ہے' حالات گواہ ہیں کہ یہ کام اس روز سے موخر کرنا مہلک ہوتا۔۔۔

پس اب جبکہ ایک قدم اٹھ چکا ہے' اس کے واپس لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا' بلکہ اب اسے آگے ہی آگے بڑھنا ہے۔ اب اس کا رکنا یا پیچھے ہٹنا --- چاہے وہ تعمیرِ سیرت ہی کے لیے کیوں نہ ہو --- ایک معرکہ کشمکش سے فرار کی حیثیت رکھتا ہے' اور فرار ایک انقلابی تحریک کے لیے ہمیشہ موت ثابت ہوتا ہے۔ اس فرار کے بعد ایک جماعت محض مذہبی فرقہ یا سیاسی جتھا بن کے رہ جاتی ہے' وہ زمانے کی امامت نہیں کر سکتی۔۔۔

اب یہ ممکن نہیں ہے کہ عوامی دور میں قدم رکھنے کے بعد ہم لوگ ان ذرائع و وسائل سے کام نہ لیں جو سیاست کے عوامی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ چنانچہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے جب ۴۸ء میں کراچی کی تقریر کے بعد یہ سوال کیا گیا کہ آپ مطالبے کو منوانے کے لیے کن طریقوں سے کام لیں گے تو موصوف نے صفائی سے یہ جواب دیا تھا کہ ہمیں اس کے لیے وہ سارے ذرائع اختیار کرنے ہوں گے جو آپ نے مطالبۂ پاکستان کے لیے اختیار کیے تھے۔ (ان کے خلافِ اسلام پہلوؤں کا استثنیٰ بہرحال اپنی جگہ پر مسلّم ہے)

اوپر کی گزارشات کا منشا صرف یہ ہے کہ اسلام کے ایک تحریک کی صورت میں ارتقاء کرتے ہوئے طبعی طور پر جو مراحل اسے پیش آرہے ہیں اور آنے والے ہیں ان کو ہمارے معترضین اور ہمارے خیر خواہ دونوں جامد مذہبیت اور دین و سیاست کی تفریق کی عینکوں سے نہ دیکھیں' اور قدم قدم پر اُپرانا چھوڑ دیں۔

دماغوں کو بلند فکر بنایئے' نگاہوں کو دور رسی کا درس دیجیے' سینوں کو فراخ رکھیے اور حوصلوں کو عالی ظرفی کی صفت سے آراستہ کیجیے' یہاں تک کہ آپ پیش آمدہ مراحل کے تقاضوں ہی کو نہیں بلکہ مستقبل بعید میں بتدریج پیش آنے والے احوال و مقامات کی ذمہ داریوں کو قبل از وقت سمجھ سکیں۔ آپ کو اپنے ملکی ماحول ہی کو نہیں' جہانی ماحول کو تفصیل سے سمجھنا چاہیے۔ آپ کو تاریخ کی سمت' ارتقاء اور وقت کے بہاؤ کی رفتار کو جاننا چاہیے۔ آپ کو اسلام کی وسعتوں پر نگاہ رکھنی چاہیے' اس کے بغیر اسلام کی انقلابی تحریک کے ہر نئے مرحلے میں داخلے کے وقت آپ کو خواہ مخواہ کی الجھن ہوگی۔

خود ہمارے لیے یہ صورتِ حالات بہت ہی مضر نتائج رکھتی ہے کہ ہم اپنی ساری قوت صرف کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں' اور ہمارے معترضین سامنے سے آکر ہمارے لیے

بقیہ بر صفحہ ۶۵

طبقۂ مترفین اور اسلام کا نظامِ عدل

مولانا گوہر رحمٰن

(چھٹی اور آخری قسط)

زکوٰۃ کے علاوہ کسی حق کے واجب نہ ہونے کے بارے میں احادیث رسولؐ کا صحیح مفہوم

قرآن و سنت اور سنّتِ خلافتِ راشدہ سے تو ثابت ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حقوق ہیں جو بعض اوقات واجب ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی وصولی جبراً بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن بعض صحیح احادیث میں آیا ہے کہ مسلمان جب زکوٰۃ ادا کر لیتا ہے تو اس پر مزید کوئی حق واجب نہیں ہوتا' اور اگر عاملین' مقررہ شرح سے زائد زکوٰۃ وصول کرتے ہیں تو ظلم کرتے ہیں' اور زکوٰۃ دینے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مقررہ مقدار سے زائد زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن و سنت میں تناقض تو نہیں ہے' اس لیے زائد از زکوٰۃ کے عدم وجوب پر دلالت کرنے والی احادیث کا صحیح مفہوم معلوم کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہے:

> مسلمانوں کے اموال میں حقوق مقدرہ راتبہ تو زکوٰۃ و عشر کے علاوہ واجب نہیں ہیں مگر حقوق غیر مقدرہ غیر راتبہ اور بھی ہیں جو بعض اوقات واجب ہو جاتے ہیں اور جبراً وصول کیے جا سکتے ہیں۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ زکوٰۃ و عشر اور دیگر شرعی واجبات کی شرح ادائیگی شرعاً" مقرر ہے' اور اس کا ادا کرنا ہمیشہ کے لیے فرض ہے۔ یہاں تک کہ اگر بالفرض زکوٰۃ کا مستحق موجود نہ ہو پھر بھی یہ فرض ساقط نہیں ہوتا بلکہ بیت المال میں زکوٰۃ جمع کرنی ہوگی جس طرح نماز روزہ ایک دائمی عبادت ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی ایک دائمی عبادت ہے۔ نہ یہ ساقط ہو سکتی ہے اور نہ اس کے نصاب اور مقدار میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا دائمی اور مقررہ مقدار کا مالی حق یقیناً زکوٰۃ کے علاوہ واجب نہیں ہے۔ لیکن کچھ حقوق ایسے ہیں جو مستقل طور پر ہمیشہ کے لیے واجب نہیں ہیں اور ضرورت کے ختم ہونے پر ان کا وجوب بھی ساقط ہو جاتا ہے۔ نہ ان حقوق کی مقدار متعین ہے اور نہ یہ ہمیشہ کے لیے مستقل طور پر عائد کیے جاتے ہیں' بلکہ حالات کے مطابق ان کی

مقدار اور وجوب کا فیصلہ کیا جاتا ہے ۔ مثلاً رشتہ داروں کا نفقہ ' فقراء و مساکین کی بنیادی ضروریات پوری کرنا (اگر زکوٰۃ سے پوری نہ ہو سکیں) ' دارالاسلام کے دفاع اور جہاد کے اخراجات پورے کرنا (اگر زکوٰۃ سے پورے نہ ہو سکیں) ' اور عوام کو سہولتیں فراہم کرنے اور قومی ترقی کے لیے بقدرِ ضرورت اغنیاء کے مال پر ٹیکس عائد کرنا۔ یہ وہ مدات ہیں جن کے لیے بوقتِ ضرورت اور بقدرِ ضرورت مزید مال لیا جاسکتا ہے ' دلائل پہلے عرض کر دیے گئے ہیں۔ زائد از زکوٰۃ کے واجب نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مقررہ مقدار میں اور ہمیشہ کے لیے واجب نہیں ہے ۔ ان احادیث کا یہی مفہوم ابو حیان اندلسی ؒ نے بیان کیا ہے (البحر المحیط' طبع ۱۹۸۳ء' ج ۲ ص ۵)۔ علامہ آلوسی ؒ اور علامہ انور شاہ کشمیری ؒ نے بھی یہی مفہوم بیان کیا ہے (روح المعانی' ج ۲' ص ۴۷' فیض الباری' ج ۳' ص ۵)

(۹) جہاد بالمال اور دارالاسلام کے دفاع کے لیے خرچ کرنا

مسلمانوں پر صرف اپنی ضروریات اور عوام کی انسانی ضروریات پوری کرنا ہی لازم نہیں ہے ' بلکہ اسلام کے غلبے اور تبلیغ و دعوت کے لیے جہاد بالمال بھی لازم ہے ۔ اسلام اور دارالاسلام کا تحفظ بھی مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے ۔ قرآنِ کریم میں جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں کا حکم دیا گیا ہے ۔ جس طرح نماز روزہ کی بدنی عبادت ادا کرنے سے زکوٰۃ و عشر اور دوسرے مالی فرائض ساقط نہیں ہو سکتے' اسی طرح جہاد بالنفس کی بدنی عبادت ادا کرنے سے جہاد بالمال کی مالی عبادت ساقط نہیں ہو سکتی ۔ البتہ اگر زکوٰۃ سے جہاد اور دفاع کے اخراجات پورے ہو سکتے ہوں تو مزید مالی امداد واجب اور فرض نہیں ہو گی ' بلکہ صرف مستحب ہو گی ۔ لیکن اگر جہاد اور دفاع کے اخراجات زکوٰۃ سے پورے نہ ہو سکیں ' اور مادی وسائل کی کمی کی وجہ سے ملک کی سلامتی خطرے میں پڑجائے یا جہاد کے عمل میں کمزوری آجائے ' تو ایسی صورت میں بقدرِ ضرورت اور بقدرِ استطاعت زکوٰۃ و عشر سے زائد مال دینا اور وسائل فراہم کرنا واجب ہو جاتا ہے ' اور حکومت کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ اگر لوگ رضا کارانہ طور پر جہاد فنڈ میں اپنی اعانتیں داخل نہ کریں تو وہ زبردستی وصول کر کے جہاد کے مصارف پورے کرے ۔

آیاتِ قرآنیہ

" اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور مت ڈالو اپنے آپ کو ہلاکت میں" (البقرہ' ۲ : ۱۹۵)

ابنِ کثیرؒ اور قرطبی ؒ کی نقل کردہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں اپنے آپ کو

ہلاکت میں ڈالنے سے مراد جہاد بالمال کا ترک کرنا ہے ۔ جب دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں لڑنا چھوڑ دیا جائے، اور دفاعی اخراجات کے لیے مال خرچ کرنا بھی چھوڑ دیا جائے ' تو دشمن غالب آجائے گا اور مسلمان ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔

"اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے بھی اور اپنی جانوں سے بھی "(التوبہ ' ۹ : ۴۱)

"بے شک مومن تو وہ ہیں جو ایمان لائے ہوں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر ' پھر شک میں نہ پڑے ہوں' اور جہاد کرتے ہوں اپنے مالوں سے اور جانوں سے اللہ کی راہ میں ۔ یہی لوگ سچے مومن ہیں (الحجرات' ۴۹ : ۱۵)

"ایمان لاؤ تم اللہ پر اس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور جانوں سے "(الصف' ۶۱:۱۱)

احادیثِ نبویہ[۱۶]

"ابو امامہ باہلیؓ سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا ' جس مسلمان نے نہ تو خود کفار کے مقابلے میں لڑائی لڑی ہو ' نہ غازی کو سامانِ جہاد دیا ہو ' اور نہ غازی کے اہلِ خانہ کی خبر گیری کی ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر قیامت سے پہلے ہی کوئی مصیبت نازل فرما دے گا " (ابوداؤد' کتاب الجہاد)

"ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا ' جس کے پاس ایک درہم یا ایک دینار یا سونے چاندی کا ایک ٹکڑا ہو' جو اس نے قرض خواہ کے لیے نہ رکھا ہو ' اور وہ اسے جہاد میں خرچ نہ کرتا ہو ' تو یہ وہ خزانہ (کنز) ہے جس سے یہ شخص قیامت کے دن داغا جائے گا" (کتاب الجہاد' ابن ابی عاصم' ج ۱' ص ۲۷۸ ' مصنف ابن ابی شیبہ' ج ۳' ص ۲۱۳ ' سنن کبریٰ بیہقی ج ۴' ص ۱۴۷ ' سنن دار قطنی' ج ۲' ص ۱۰۰ - ۱۰۱)

حدیث کا تعلق اس صورت سے ہے کہ جہاد بالمال فرض ہو چکا ہو ' صرف مستحب نہ ہو ۔ جب مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے دشمن کے غالب آجانے کا خطرہ ہو تو اس صورت میں اپنی بنیادی ضرورت اور قرض خواہ کے حق سے زائد مال امیر کے مطالبے پر جہاد فنڈ میں دینا واجب ہو جاتا ہے ۔ اور مالی واجبات ادا نہ کرنے والوں کو قیامت کے دن شدید عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حدیث کی توجیہہ اس لیے کی گئی ہے کہ عام حالات میں ضرورت سے زائد مال وارثوں کے لیے بچا کر رکھنا ممنوع نہیں ہے۔

سنّتِ اصحاب رسولؐ

دورِ نبویؐ میں اصحاب رسولؐ کے اندر جذبۂ جہاد اور جذبۂ اطاعت بہت زیادہ تھا۔ اس لیے

جہاد کے مصارف کے لیے جبری وصولی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی ' بلکہ رسولؐ اللہ کا معمولی سا اشارہ بھی ان کے لیے کافی تھا ۔ سیرتِ صحابہؓ اور جہاد سے متعلق کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ جہاد بالمال میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے ' صحابہؓ کے اس جذبے کا مثالی نمونہ رجب ۹ھ میں غزوۂ تبوک کے موقع پر دیکھنے کے قابل تھا۔ بہت طاقتور دشمن قیصرِ روم سے مقابلہ درپیش تھا' موسم سخت گرم تھا' راستہ طویل اور کٹھن تھا ' اور مالی لحاظ سے بشدید عسرۃ یعنی تنگدستی کی حالت تھی۔

رسولؐ اللہ نے مسجدِ نبوی کے منبر پر کھڑے ہو کر جب جہاد فنڈ میں مالی امداد کا حکم دیا اور ترغیب دلائی ' تو صحابہؓ نے صدقاتِ کثیرہ پیش فرما دیے ۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے اپنا سارا مال پیش کیا ' جو کل ۴ ہزار درہم تھا (ایک درہم ۷۰ جو کے دانوں کے وزن کے برابر ہوتا ہے یعنی ۳ ماشہ ۱/۵ ۱ رتی) حضرت عمرؓ نے اپنا آدھا مال دے دیا۔ ان کا یہ آدھا مال بھی ۱۰۰ اوقیہ چاندی یعنی ۴ ہزار درہم تھا (مسند احمد ' ج ۱' ص ۷ ۴۳' تاریخ ابن عساکر' ج ۱' ص ۱۱۱)

عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے ۸ ہزار درہم داخل کیے ۔ حضرت عباسؓ ' طلحہؓ ' سعد بن عبادہؓ اور محمد بن مسلمہؓ نے بھی اپنی استطاعت کے مطابق اس جہادِ مالی میں حصہ لیا۔ عاصم بن عدیؓ اور عامر انصاریؓ نے ۹۰ - ۹۰ وسق کھجوریں پیش کی تھیں (ایک وسق ۵ من ڈھائی سیر کا ہوتا ہے تو ۹۰ وسق کے ۴۵۵ من ۲۵ سیر بنتے ہیں) ایک انصاری صحابیؓ نے ' جسے ابو عقیل کہا جاتا تھا' رات کو ایک شخص کا کام کر کے دو صاع کھجوریں مزدوری میں لی تھیں ۔ ایک صاع اہلِ خانہ کے لیے گھر میں رکھ دیں ' اور ایک صاع جہاد فنڈ میں جمع کرا دیں ا(ایک صاع ۲۷۰ تولے کا ہوتا ہے) منافقین نے اس شخص کا مذاق بھی اڑایا (تاریخ ابن عساکر' ج ۱' ص ۱۰۶ - ۱۱۱)

لیکن مقدار اور کمیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ مال حضرت عثمان بن عفانؓ نے پیش فرمایا تھا۔ تین سو اونٹ بمعہ کمبلوں اور کجاووں کے ' اور ایک ہزار دینار رسولؐ اللہ کی خدمت میں پیش کیے۔ تو رسول اللہؐ نے فرمایا ' عفان کا یہ بیٹا اگر اس کے بعد اور کچھ بھی نیکی (نفلی) نہ کرے تو اس کے لیے کوئی نقصان نہیں ہو گا (مسند احمد' ج ۴ص ۷۵ و ج ۵ ص ۶۳' ترمذی فی المناقب ' التاریخ الکبیر' امام بخاری ۳ - ۱ص ۲۳۶' تاریخ الاسلام للذہبی' ص ۶۲۸ - ۶۲۹)

ابو یعلی الموصلی (م ۳۰۷ھ) نے عبد الرحمٰن بن عوفؓ کا قول نقل فرمایا ہے کہ عثمان بن عفانؓ نے جیش العسرۃ کو (تبوک) ۷ سو اوقیہ سونا دیا تھا ایک اوقیہ ساڑھے دس تولے کا ہوتا ہے تو

اس حساب سے ۳۵۰۷ تولے سونا بنتا ہے (مسند ابو یعلیٰ' ج ۲' ص ۱۶۱' مسند عبد الرحمٰن بن عوف)

اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن عمر بن ابان آیا ہے جسے بخاریؒ' ابو حاتمؒ اور ابوزرعہؒ نے ضعیف کہا ہے۔ ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) نے حسن بصری کا قول نقل فرمایا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے غزوہ تبوک کے موقع پر ۹۵۰ اونٹ اور ۵۰ گھوڑے بھی دیے تھے (تاریخ الاسلام حصہ خلفائے راشدین ص ۵۷۰) لیکن اس کی سند میں بھی خلید بن دعلج السدوسی نامی راوی آیا ہے جسے دار قطنی وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ زیادہ مشہور اور صحیح روایت یہی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ۳ سو اونٹ اور ایک ہزار دینار دیے تھے۔

جب صحابہ کرامؓ کے جذبہ انفاق فی الجہاد کا عالم یہ تھا تو زبردستی وصول کرنے کی اس وقت ضرورت کیا تھی ؟

مذکورہ آیات واحادیث میں جہادِ مالی کا حکم دیا گیا ہے ' اسے ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے' اور جہاد بالمال نہ کرنے والوں کو ہلاکت دنیوی اور عذاب اخروی کی وعید سنائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واجبات شرعیہ اور مقتضیاتِ ایمانیہ میں سے ہے۔ ان آیات و احادیث میں زکوٰۃ کا نام نہیں لیا گیا ہے بلکہ عمومی الفاظ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے حکومت کا یہ حق بلکہ فرض ہے کہ اگر لوگ رضاکارانہ طور پر جہاد فنڈ میں کچھ نہ دیتے ہوں' اور ضرورت شدید ہو ' تو بقدرِ ضرورت اور بقدرِ استطاعت جبراً وصول کرے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اگر قومی خزانہ خالی ہو یا اس میں اتنا مال نہ ہو کہ فوج کے اخراجات پورے ہو سکیں تو حکومت اغنیاء سے ضرورت کے مطابق مال زبردستی لے سکتی ہے۔ حنفیہ کے مشہور فقیہہ علامہ المرغینانی صاحبِ ہدایہ ' امام شاطبیؒ اور ابنِ قیمؒ نے بھی اسی طرح لکھا ہے (المستصفی للغزالی' ج ۱' ص ۳۰۳ - ۳۰۴ ' ہدایہ مع فتح القدیر' ج ۷' ص ۲۲۲ ' الاعتصام للشاطبی' ج ۲' ص ۲۹۵ - ۲۹۶' زاد المعاد' لابن قیم' ج ۴' ص ۵۵۸)

(۱۰) مصالحِ عامہ اور دفاع کے لیے منصفانہ ٹیکس

گزشتہ صفحات میں دلائلِ شرعیہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ زکوٰۃ و عشر کے علاوہ بھی مسلمانوں کے مال میں حقوق ہیں' اور جن احادیث میں آیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ کوئی حق واجب نہیں ہے ان کی یہ توجیہہ بھی بیان ہو چکی ہے کہ اس سے مراد مقررہ شرح کے ساتھ دائمی حق ہے جو مستقل طور عائد نہیں کیا جا سکتا۔ اسی اصول کی روشنی میں رشتہ داروں کا خرچہ ادا کرنا '

بنیادی ضرورت سے محروم لوگوں کی کفالت کے لیے زکوٰۃ سے زائد مال دینا (اگر بالفرض زکوٰۃ کافی نہ ہو)' اور جہاد کے اخراجات کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ مال دینا واجب ہے' اور حکومت یہ مال قانوناً" وصول کرنے کا بھی حق رکھتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کو سہولتیں فراہم کرنے کے لیے اور حکومت کا نظام چلانے کے لیے ٹیکس لگایا جا سکتا ہے یا نہیں ؟

الف ۔ پاکستان میں ٹیکسوں کا مروّجہ نظام عادلانہ نہیں ہے

پاکستان میں ٹیکسوں کا' بالخصوص انکم ٹیکس کا' نظام منصفانہ نہیں ہے' بلکہ ظالمانہ ہے۔ یہ نظام در اصل انگریز کی سامراجی اور استحصالی حکومت سے ورثے میں ملا ہے' جسے انگریزوں کے یہ سیاسی شاگرد اب تک بحال رکھے ہوئے ہیں۔ اس نظام میں ٹیکسوں کا بوجھ مترفین اور سرمایہ داروں اور جاگیرداروں پر تو برائے نام پڑتا ہے' تقریباً ۸۰ فی صد سے زیادہ بوجھ غریب عوام پر پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اشیاء صرف پر عائد کردہ ٹیکس کا بوجھ صارفین ہی پر پڑے گا۔ بلا واسطہ اور براہ راست ٹیکس تو برائے نام ہوتا ہے' اصل ٹیکس بالواسطہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ قومی خزانے کو فضول خرچیوں اور عیاشیوں پر اڑایا جاتا ہے اور حقیقی ضرورت کے بغیر عوام پر ٹیکس لگا دیے جاتے ہیں۔ اس نظام میں بنیادی اور نتیجہ خیز تبدیلیوں اور اصلاحات کی ضرورت ہے۔

ب ۔ مصالح عامہ کے لیے ٹیکس لگانا "مصالح مرسلہ" میں شامل ہے

دور حاضر کی طرح ٹیکس عائد کرنے اور اس کا باقاعدہ ایک نظام بنانے کی دورِ نبوت میں اور دور خلافت راشدہ میں نہ کوئی مثال ملتی ہے اور نہ اس کی ممانعت اور عدم جواز کی کوئی دلیل ملتی ہے۔ اگرچہ اس کے نظائر ملتے ہیں اور ان نظائر کی دلیلیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً جزیہ اور خراج کی مثالیں اور نظیریں موجود ہیں مگر ان دونوں کا تعلق غیر مسلموں سے ہے۔ فقہی اور قانونی زبان میں ایسے امور کو مصالح مرسلہ یا **استصلاح** کہا جاتا ہے' جن کی قرآن و سنت اور اجماعِ صحابہؓ میں نہ ممانعت کی گئی ہو اور نہ ان کے جواز کی تصریح کی گئی ہو۔ قرآن و سنت کی نصوص اور اجماع کی خاموشی کے وقت مصالح مرسلہ قانون سازی کا ایک ماخذ ہے۔ اسلامی حکومت کی مجلسِ شوریٰ حالات کے تقاضوں اور عوام کی بہبود کی خاطر مفاد عامہ سے متعلق جو مناسب سمجھے فیصلہ کر سکتی ہے اور قانون بنا سکتی ہے۔

عوامی مفاد اور قومی ترقی کے لیے ٹیکس لگانا بھی مصالح مرسلہ میں شامل ہے۔ اسلام میں اصولاً یہ جائز ہے' اس لیے کہ اس کی ممانعت نہیں کی گئی۔ عوام کی سہولت کے لیے سڑکیں بنانا' ڈیم

بنانا' نہریں بنانا' شفاخانے بنانا' سکول کالج اور یونیورسٹیاں بنانا' مواصلات کا نظام قائم کرنا' سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے ادارے بنانا' بجلی اور پانی کی بہم رسانی کا نظام قائم کرنا اور اسے ترقی دینا' ذرائع ابلاغ کا نظام قائم کرنا' انتظامیہ' عدلیہ اور مقننہ کا نظام قائم رکھنا اور اسے بہتر بنانا' اور ریاست کے دفاع کے لیے تربیت یافتہ اور منظم فوج تیار رکھنا اور اسے جدید ترین عصری اسلحہ سے مسلح کرنا' یہ سارے کام وہ ہیں جو ظاہر ہے کہ مصالح مرسلہ اور مفاد عامہ سے تعلق رکھتے ہیں' اور یہ سارے کام ظاہر ہے کہ سرمائے کے بغیر جاری نہیں رہ سکتے۔ جب زکوٰۃ کے مصارف محدود ہیں' تو آخر یہ سارے اخراجات ٹیکس لگائے بغیر کیسے پورے کیے جا سکیں گے؟ عوام کے نمائندوں پر مشتمل مجلس شوریٰ عوام ہی کے مفاد و مصالح کے لیے بقدر ضرورت اور بقدر استطاعت منصفانہ ٹیکس لگا کر اور وصول کر کے جب یہ اخراجات پورے کرے تو اس میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے' بلکہ ایسا کرنا مفید بھی ہے اور ضروری بھی۔

ج - جو فائدہ اٹھاتا ہے وہ اس کا خرچہ بھی برداشت کرے

ٹیکس کا منصفانہ نظام قائم کرنے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ فقہاء نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ **الغرم بالغنم**' یعنی جو فائدہ اٹھاتا ہے وہ اس کا خرچہ بھی برداشت کرے۔ جب عوام اپنی حکومتوں سے سہولتیں مانگتے ہیں اور ان سہولتوں سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں' تو مذکورہ فقہی قاعدے کے مطابق ان کو ان سہولتوں کا خرچہ بھی برداشت کرنا ہوگا حکومت تو در اصل عوام کی وکیل اور خادم ہوتی ہے جو عوام سے ٹیکس وصول کر کے واپس انہی پر خرچ کرتی ہے' اور اس آمد و خرچ کا ایک منظم اجتماعی نظم قائم کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام' مصلحت اور عقل دونوں کے مطابق ہے۔ البتہ اگر ٹیکس غریبوں پر لگایا گیا ہو حقیقی ضرورت کے بغیر لگایا گیا ہو' یا یہ ٹیکس عوام کی خدمت کی بجائے حکمران طبقے یا کسی اور طبقے کے مفادات پر خرچ ہو رہا ہو' جیسا کہ پاکستان میں ہو رہا ہے' تو پھر یہ ظلم ہے۔

مذکورہ قاعدہ مشہور حنفی فقیہہ احمد بن عمر الخصاف" (م ۲۶۱ھ) نے اپنی کتاب "شرح ادب القاضی" میں بھی ذکر کیا ہے (ج ۳' ص ۱۶۳ - ۱۶۵)' اور مجلۃ الاحکام العدلیۃ کی دفعہ ۸۷ میں بھی اس کا ذکر ہوا ہے ---- یہ قاعدہ در اصل ایک حدیثِ رسولؐ سے ماخوذ ہے کہ "**الخراج بالضمان**" "جو نقصان کی ذمہ داری اٹھاتا ہے' فائدہ حاصل کرنا بھی اسی کا حق ہے' اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جو فائدہ اٹھاتا ہے وہ اس کا تاوان بھی برداشت کرے۔ یہ حدیث ابو داود' ترمذی اور نسائی نے کتاب البیوع میں نقل کی ہے اور یہ مسند احمد میں بھی موجود ہے۔

د- مکس اور عشور سے ظالمانہ اور شاہی ٹیکس مراد ہیں

احادیث میں "مکس" اور عشور" کی جو مذمت آئی ہے' اور صاحبِ مکس کے لیے عذاب کی وعید کا ذکر ہوا ہے تو شارحینِ حدیث اور فقہاءؒ نے لکھا ہے کہ اس سے جاہلیت کے بادشاہوں کے ٹیکس مراد ہیں' جو ظالمانہ تھے' غریبوں پر لگائے جاتے تھے' بلا ضرورت لگائے جاتے تھے' اور عوامی مفاد کی بجائے شاہ خرچیوں پر اڑائے جاتے تھے۔ اسلامی حکومت میں ٹیکس مجلسِ شوریٰ لگائے گی اور وہ عوامی مفاد پر خرچ ہو گا۔

ہ- ٹیکس لگانے کے جواز کی شرائط

مفادِ عامہ کے لیے ٹیکس لگانے کی کچھ شرائط ہیں جن کو ملحوظ رکھنا لازم ہے۔

۱- پہلی شرط تو یہ ہے کہ مفادِ عامہ یا دفاع کے لیے مالی وسائل فراہم کرنے کی حقیقی ضرورت ہو' اور موجود وسائل کافی نہ ہوں۔ مصر کے حکمران نے جب تاتاریوں کے مقابلے کا ارادہ کیا تو جنگی اخراجات کے لیے تاجروں سے قرض لینے کا فیصلہ کیا۔ اس پر اس وقت کے سلطان العلماء عز الدین ابن عبدالسلام (م ۶۶۰ھ) نے کہا کہ "تمھارے اور تمھاری بیگمات کے پاس جو کچھ ہے وہ حاضر کرو' اور اپنے امراء کی بیگمات کے زیورات بھی لے آؤ اس لیے کہ سب حرام ذرائع سے حاصل ہوئے ہیں' اس کے بعد اگر ضرورت باقی رہے تو پھر قرض لیا جا سکتا ہے۔ (طبقات الشافعیہ الکبریٰ' ج ۸' ص ۲۱۵)

اسی طرح جب الملک الظاہر بیبرس نے انہی تاتاریوں کے مقابلے کے لیے لشکر تیار کیا اور علماء سے دفاعی ٹیکس لگانے کا فتویٰ طلب کیا' تو امام نوویؒ (م ۶۷۶ھ) نے فرمایا "تمھارے پاس ایک ہزار غلام ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس ایسی خلعتیں ہیں جن پر سونا چڑھا ہوا ہے' اور دو سو کنیزیں ہیں جن میں ہر ایک کے پاس وافر زیورات ہیں۔ یہ سب حاضر کرو' اس کے بعد اگر ضرورت باقی رہے تو میں ٹیکس لگانے کے فتویٰ پر دستخط کر لوں گا۔ اس حق گوئی کے جرم میں امام نوویؒ کو جلا وطن کر دیا گیا (ترجمہ امام نووی' علامہ سخاویؒ)

۲- دوسری شرط یہ ہے کہ ٹیکسوں کا نظام ایسا بنایا جائے کہ غریب عوام پر اور عام صارفین پر بوجھ نہ پڑے' بلکہ معاشرے کے اغنیاء کی فاضل دولت پر یہ بوجھ ڈالا جائے۔

۳- تیسری شرط یہ ہے کہ ٹیکسوں سے حاصل کردہ رقوم عوام کی بہبود و سہولت پر خرچ کی جائیں یعنی مصالحِ عامہ پر خرچ کی جائیں' خواہ ترقیاتی منصوبے ہوں یا انتظامی اخراجات یا دفاعی

اخراجات ' خرچ میں اسراف و تبذیر سے بھی اجتناب کیا جائے ' اور عوام کو سہولتیں فراہم کرنے میں بخل سے بھی اجتناب کیا جائے ' بلکہ اقتصاد و اعتدال پر عمل کیا جائے۔ غیر اسلامی پروگراموں کے لیے ' یا مخصوص قسم کے مراعات یافتہ طبقے کو سیاسی رشوتیں دینے کے لیے ' یا حکمرانوں کی شخصی خواہشات پوری کرنے کے لیے ' نہ ٹیکس لگانا جائز ہے اور نہ ان کاموں پر خرچ کرنا جائز ہے۔

۴- چوتھی شرط یہ ہے کہ ہر قسم کے ٹیکس اور قومی محصولات مجلسِ شوریٰ کے مشورے اور فیصلے کے عین مطابق عائد کیے جائیں۔ اسلامی نظام ایک شورائی نظام ہے جس میں ہر قسم کے قومی فیصلے مسلمانوں کے معتمد نمائندوں (اہلِ حل و عقد) کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ امیر کو شوریٰ کے فیصلے کے خلاف ویٹو کا حق حاصل نہیں ہے ' اِلّایہ کہ اس کے پاس قرآن و حدیث کی واضح دلیل موجود ہو۔

(۱۱)۔ وراثت کے شرعی احکام کا نفاذ

حلال طریقے پر مال و جائیداد حاصل کرنے اور تمام مذکورہ حقوق واجبہ ادا کرنے کے بعد بھی اگر مال حلال منقولہ یا غیر منقولہ بچ جائے تو یہ کوئی بری چیز نہیں ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اپنے پس ماندگان کو اغنیاء چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تو ان کو دوسروں کا محتاج چھوڑ دے۔ ارتکاز کے خاتمے اور دوسری مصالح کے لیے شریعت میں وراثت کا مکمل نظام موجود ہے۔ میت کے ترکے میں بیٹوں کا بھی حصہ ہے اور بیٹیوں کا بھی ۔ اگر شرعی احکام کے مطابق میراث تقسیم کی جائے تو اس سے ارتکازِ دولت میں معتدبہ کمی آجائے گی ۔

رسائل و مسائل

ایصالِ ثواب

سوال :

دریافت طلب مسئلہ یہ ہے کہ کسی مرے ہوئے کو قرآن پڑھ کر ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اسی طرح حج اور قربانی کسی مرے ہوئے کی جگہ دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

جواب :

عبادات کی تین قسمیں ہیں۔ محض بدنی' جیسے نماز' روزہ۔ محض مالی' جیسے زکوٰۃ اور بدنی و مالی عبادات سے مرکب عبادات جیسے' حج۔ایصالِ ثواب ان تمام عبادات کا جائز ہے اور نیابت یعنی کسی دوسرے کی جگہ کسی عبادت کو ادا کرنا صرف دوسری دونوں عبادتوں میں جائز ہے۔ زکوٰۃ بھی دوسرے کی جگہ دی جاسکتی ہے۔ اور حج بھی دوسرے کی جگہ کیا جاسکتا ہے۔ فرض حج دوسرے کی طرف سے کرنے میں شرط یہ ہے کہ وہ انسان خود حج ادا کرنے سے عاجز ہو اور موت تک عجز قائم رہے۔ البتہ نفل حج دوسرے کی جگہ ایسی صورت میں بھی کیا جاسکتا ہے کہ جس کی طرف سے حج کیا جارہا ہے وہ عاجز نہ ہو۔ ہدایہ میں ہے۔

ترجمہ : اس باب میں بنیادی بات یہ ہے کہ ایک انسان کے لیے اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک جائز ہے کہ وہ اپنے عمل کا ثواب چاہے نماز' روزہ' صدقہ ہو یا کوئی عبادت دوسرے کو پہنچائے' اس لیے کہ روایت کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوخوبصورت مینڈھوں کی قربانی دی'ایک کی اپنی طرف سے اور دوسرے کی اپنی امت کی طرف سے۔ انکی طرف سے جنہوں نے توحید کا اقرار کیا ہو اور آپؐ کی تبلیغ حق کی شہادت دی ہو۔ عبادت کی کئی اقسام ہیں۔ محض مالی جیسے زکوٰۃ' محض بدنی جیسے نماز اور دونوں سے مرکب جیسے حج۔ نیابت پہلی نوع میں ہوسکتی ہے۔ اختیاری اور

اضطراری دونوں حالتوں میں؛ اس لیے کہ مقصود نائب کے فعل سے پورا ہوجاتا ہے اور دوسری نوع میں کسی بھی حال میں نیابت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ مقصود یعنی نفس کو مشقت میں ڈالنا' نائب کے فعل سے حاصل نہیں ہوتا' اور تیسری نوع میں عجز کی صورت میں نیابت ہوسکتی ہے۔ مالی جز کی وجہ سے کہ مال خرچ کرکے اس میں کمی کے ذریعہ مشقت اٹھانا اس میں پایا جاتا ہے۔ لیکن قدرت کی صورت میں نیابت نہ ہو سکے گی' اس لیے کہ نفس پر کوئی بوجھ نہیں پڑا۔ شرط یہ ہے کہ عجز موت کے وقت تک قائم رہے کیونکہ حج عمر بھر کا فرض ہے۔ اور نفلی حج میں نیابت قدرت کی حالت میں بھی جائز ہے۔ کیونکہ نفل کے باب میں وسعت ہے۔ پھر ظاہر مذہب یہ ہے کہ حج اس آدمی کی طرف سے ہوگا جس کی طرف سے کیا گیا ہے اور احادیث جو اس باب میں آئی ہیں وہ اس کی شہادت دیتی ہیں کہ جیسے خثعم قبیلہ کی عورت کا واقعہ کہ اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اپنے والد کی طرف سے حج اور عمرہ کرو اور امام محمد سے ایک روایت ہے کہ حج اس آدمی کا شمار ہوگا جس نے حج کیا ہے' اور حج کرانے والے کو خرچ کا ثواب ہے کیونکہ یہ بدنی عبادت ہے اور عاجز ہونے کی صورت میں انفاق حج کے قائم مقام ہوجائے گا جیسے فدیہ روزے کی جگہ۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے سورۃ النجم ۳۸ - ۳۹ کی تفسیر کرتے ہوئے تفہیم القرآن جلد پنجم' حاشیہ نمبر ۳۷ - ۳۸ میں ان مسائل کی اچھی طرح وضاحت فرمائی ہے۔ آپ متعلقہ حصے کا مطالعہ فرمالیں۔ مولانا رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

یہ کثیر روایات جو ایک دوسرے کی تائید کررہی ہیں اس امر کی تصریح کرتی ہیں کہ ایصالِ ثواب نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہرطرح کی عبادات اور نیکیوں کے ثواب کا ایصال ہوسکتا ہے۔ اور اس میں کسی خاص نوعیت کے اعمال کی تخصیص نہیں۔

قتل کا جھوٹا الزام

سوال :

اگر کوئی شخص کسی بے گناہ پر قتل کا جھوٹا الزام لگائے تو قرآن و حدیث کی رو سے کیا حکم ہے ؟

جواب :

کسی پر بہتان لگانا گناہ کبیرہ ہے۔ قتل کے بہتان سے خطرہ ہے کہ مقتول کے ورثاء اس شخص کو' جس پر بہتان باندھا گیا ہو' اپنے طور پر قتل کردیں یا کوئی اور نقصان پہنچائیں۔ اگر عدالت میں جھوٹی گواہی دے کر بہتان باندھا گیا ہو تو خطرہ ہے کہ عدالت اس کے بارے میں قتل کا حکم صادر کر دے۔ ایسی صورت میں بہتان لگانے والے کو تاوان بھی ادا کرنا ہوگا اور آخرت میں اسے اس کے گناہ کی سزا بھی ملے گی۔ قرآن پاک میں کئی جگہ جھوٹوں پر لعنت آئی ہے : لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ حدیث شریف میں جھوٹی گواہی کو کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس لیے اگر عدالت میں ثابت ہو جائے کہ فلاں شخص نے بہتان باندھا ہے تو وہ اسے تعزیری سزا دے سکتی ہے' نیز اسے بہتان کے نتیجہ میں پہنچنے والے نقصان کا تاوان بھی ادا کرنا ہوگا۔ ہدایہ میں ہے :" **وعلیھم ضمان ما اتلفوہ بشھادتھم** "(انہیں اس نقصان کا تاوان ادا کرنا ہوگا جو جھوٹی گواہی دے کر انہوں نے پہنچایا ہے۔)

جس شخص نے بہتان لگایا ہے اسے چاہیے کہ جلد از جلد اپنے جھوٹ کا اعلان کردے تاکہ اس کے بہتان سے متعلقہ شخص کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اگر اسے کوئی نقصان پہنچ گیا تو دنیوی طور پر اسے تاوان ادا کرنا ہوگا اور آخرت میں اسے شدید ترین سزا ملنے کا خطرہ ہے۔ اس لیے کہ اس نے ظلم کیا ہے اور حقوق العباد کو نقصان پہنچایا ہے۔ بالفرض جھوٹے بہتان پر نقصان پہنچ گیا تو نقصان پہنچانے والے کے ساتھ یہ بھی مجرم ہوگا اور اللہ کی عدالت سے اپنے گناہ کبیرہ کی سزا پائے گا۔

بقیہ : اسلامی تحریک کے مراحل دورِ حاضر میں

رکاوٹ بنیں اور ہمارے خیرخواہ پیچھے سے پکڑ کر ہمیں کھینچ رہے ہوں۔

معترضین سے تو ہم زیادہ توقعات وابستہ نہیں کرسکتے' البتہ اپنے خیرخواہوں سے ضرور یہ امید کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا تصریحات پر وہ خاص طور پر غور و فکر کرکے جماعت کی راہِ عمل کا ایک صحیح اندازہ قائم کریں گے کہ وہ کدھر سے ہو کر کدھر کو جاتی ہے۔ یہ حقیقت اگر ایک مرتبہ ذہن نشین ہوجائے تو پھر انشاء اللہ ایسا نہ ہوگا کہ قدم قدم پر آپ اپنے اندر ایک ذہنی انتشار محسوس کریں اور ہر مرحلے پر ارشاد فرمائیں "**لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا**" (سورۂ کہف)۔

(محترم نعیم صدیقی کی کتاب معروف و منکر سے اقتباسات)

مطبوعات

دیوارِ برہمن : از پروفیسر مرزا منور۔ ۳۹۹ صفحات' کمپیوٹری طباعت' مضبوط جلد۔ قیمت ۱۹۰ روپے۔ ناشر: صلاح الدین ایوبی۔ ملنے کا پتہ : مکتبہ وحدت ملی' ۴۴ بی' اردو بازار' لاہور۔

اپنے گرامی مرتبہ مخلص دوست منور مرزا' اولاً" سب سے بڑھ کر ماہرِ اقبالیات ہیں اور اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر۔ مگر وہ اپنے دوسرے موضوع ہندو کی اخلاقی پستی' اعتقادی لامعنیت اور سیاسی چانکیائیت' نیز مسلم آزاری اور مسلم کشی کی مہارت اور پاکستان دشمنی کی متعصبانہ اور منتقمانہ کارروائیوں کے کچھ اور بھی زیادہ ماہر ہیں۔ انہوں نے کتاب میں اس حقیقت کو واضح کردیا ہے کہ نہایت پیچیدہ اور مضحکہ انگیز صنمیات اور تقسیم معاشرہ کے ورن آشرم سسٹم اور کھیل تماشے کی مذہبی تقاریب کو دیوارِ برہمن نے احاطہ کیا ہوا ہے' تاکہ نہ اس جیل کے قیدی باہر نکل سکیں اور نہ باہر کی برتر اقوام اور تہذیبوں کے اثرات اندر داخل ہوسکیں۔ آج کل دیوار برلن کے ٹوٹنے کے ساتھ قافیہ ملاتے ہوئے یہ سلوگن اٹھایا گیا ہے کہ دیوارِ برہمن کو بھی توڑ دیا جائے۔ برہمن کی دیوار تو بڑی مقدس ہے' اصل مراد اس سلوگن سے یہ ہے کہ پاک بھارت سرحد کی دیوار توڑ دی جائے تاکہ اس مردم خور دیوار سے جو مسلمان بچ نکلے تھے وہ بھی پاکستان کا وجود ختم کرکے اپنے آپ کو اس دیوار کا شکار بنا دیں۔

تمہیدی کلمات طویل ہوگئے' اصل بات عرض کرنے کی یہ ہے کہ ہندو قوم کی پستیوں اور اس کے مسلم دشمن تعصبات اور اپنے فکر و تہذیبی احساس کمتری کے ردعمل میں انتقام لینے کی جو لمبی تاریخ برہمنی مہاجنی سامراج نے پیدا کی ہے' اس کے ایک ایک باب اور ایک ایک ورق کو ضروری تفصیل کے ساتھ اپنے خاص انداز میں پروفیسر صاحب نے اپنے قارئین پر واضح کیا ہے۔ یہ تاریخ ایسی ہے کہ نئی نسلوں کو اس سے پوری طرح آگاہ رکھنا چاہیے کیونکہ ابھی نہ جانے کتنے فتنہ ہائے حشرانگیز آئندہ اٹھتے رہیں گے۔ پروفیسر صاحب نے انگریزی امپیریلزم اور کانگریس اور

مسلم لیگ کی تاریخ ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف تک دلآویز اور دلسوز طریق سے سمیٹ لی ہے۔ اور اس عجوبہ قوم کے اسرار و رموز کو نمایاں کیا ہے کہ اس کے کلچر کی بنیاد گائے کے گوبر پر ہے۔

آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ محض یہ بات کہ آزادی سے اپنے آپ کو نشوونما دینے کا جو میدان مسلمانوں نے پاکستان کے نام سے حاصل کرلیا ہے' اس کی وجہ سے کتنا شدید اضطراب اور کتنے زہریلے جذبات برہمنیت اور ہندویت کے سینے میں چھپے ہوئے ہیں۔ ان کا بس چلے تو پاکستان کے ساتھ وہی سلوک کریں جو وہ بابری مسجد کے ساتھ کر رہے ہیں۔

ان حقائق کو جاننے کے لیے پروفیسر محمد منور صاحب کی کتاب دیوارِ برہمن کو ہر طبقے کے لوگ غور سے پڑھیں اور یہ اندازہ کریں کہ پاکستان تنخواہوں اور نوکریوں اور وزارتوں اور ممبریوں یا قتل اور اغوا اور خیانت کے لیے نہیں بنایا گیا۔ یہ ایک بڑے عالمی تہذیبی انقلاب کے لیے بنا ہے اور اس کے لیے قدم آگے بڑھانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ برہمنی مہاجنی شرپسندوں سے تحفظ کا انتظام نہ ہوجائے۔ اور دنیا پر بڑا احسان ہوگا اگر اس اقوام خور دیوار نفرت و تعصب کو پیوند زمیں کردیا جائے۔

(ن - ص)

قرآنِ حکیم، ترجمہ سورۃ آل عمران و سورۃ نساء: مرتبہ: محترم مولینا سیّد شبیر احمد۔ بہ اہتمام قرآن آسان تحریک رجسٹرڈ۔ بڑے سائز کے ۷۵ صفحات۔ ہدیہ ۲ روپے فی جلد۔ پتہ: ۱۳' اے ۲ - ایجوکیشن ٹاؤن' وحدت روڈ' لاہور۔

یہ قرآنِ حکیم کی مختلف سورتوں کے ترجمے کا ایک خاص سلسلہ ہے' جس کا تعارف ہم پہلے بھی کراچکے ہیں۔ اس مرتبہ سورۃ آل عمران اور سورۃ نساء کا ترجمہ سامنے ہے۔ اس ترجمے کی قدر و قیمت سیّد شبیر احمد صاحب کی علمیت اور دین کے نہایت صحیح شعور کی وجہ سے ہے۔

ترجمہ نہ صرف توجہ اور احتیاط سے کیا گیا ہے بلکہ اس کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ آیات کا ترجمہ کرتے وقت عربی عبارت کے الفاظ اور اردو عبارت کے الفاظ میں جگہوں کا جو ادل بدل ہوجاتا ہے اس کی وجہ سے غیر عربی دان قاری کو مشکل پیش آتی ہے کہ وہ کس لفظ کو کس کا ترجمہ سمجھے۔ سیّد شبیر صاحب نے دلچسپ حل نکالا کہ ہر آیت کے الفاظ کو دو الگ الگ رنگوں (نیلا اور سرخ) میں چھپوایا۔ اب ترجمہ میں بھی یہ اہتمام کیا کہ سرخ الفاظ کا ترجمہ سرخ اردو الفاظ میں اور نیلے الفاظ کا ترجمہ نیلے الفاظ میں تیار کرکے حسنِ طباعت سے سفید کاغذ پر پیش

کیا۔ ہر صفحے کے دو کالم بنا کر داہنی طرف عربی آیات (الگ الگ) اور بائیں جانب اردو ترجمہ کی عبارت متقابلاً" مرتب کیں۔

یہ نہایت دلچسپ ترجمہ ہے' جس سے بڑے اور بچے اور خواتین یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آخری صفحے پر قرآن آسان تحریک کے اغراض و مقاصد درج کیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادارہ اہلِ خیر کے اشتراک و تعاون سے چل رہا ہے' اسی لیے قیمتیں بہت کم رکھی گئی ہیں۔ ادارے سے اشتراک کے لیے درخواست برائے رکنیت کا فارم بھی منسلک ہے جس میں مختلف اصحاب اپنی حیثیت کے مطابق ۵ ہزار روپے سالانہ (تا حیات رکنیت) دو صد روپے سالانہ (عام رکنیت) اور علاوہ ازیں جو جب جتنا حصہ لینا چاہے' فلاح آخرت کا ذریعہ ہے۔

زیر تبصرہ حصے کے بعد سورۂ مائدہ و سورۂ انعام آئیں گی۔

(ن ۔ ص)

سچی کہانی : از جناب حکیم محمد سعید۔ معاونین مجلس ادارت جناب مسعود احمد برکاتی و رفیع الزمان زبیری۔ فی حصہ ۲۵ روپے۔ ناشر: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سنٹر' ناظم آباد کراچی۔

محترم حکیم صاحب کی خصوصی توجہ کا ایک دائرہ نو نہالانِ پاکستان کا بھی ہے۔ موصوف تمام پاکستان کے شہروں میں فلاح و تعمیر کے نقشے پر اس تنظیم کو قائم کر کے اجتماعات بھی منعقد کر رہے ہیں' اور نونہالوں کے لیے تیزی سے دلچسپ و مفید ادب بھی پیدا کر رہے ہیں۔ اس ادب کا نام ہی "نونہال ادب" ہے۔ بچوں کے لیے پاکیزہ لٹریچر مہیا کرنے میں ہمدرد نے بہت اچھا مقام حاصل کرلیا ہے۔

متعدد کتب ہمدرد برائے تبصرہ سامنے ہیں مگر تقدیر ادائے فرض (کماحقہٗ) کا موقع ہی نہیں دیتی۔ اس کتاب کا اصل نام "سچی کہانی میری ڈائری کی زبانی" ہے۔ ہر ماہ کی ڈائری الگ الگ چھپ رہی ہے۔ تین ماہ کے تین حصے موصول ہیں۔ واللہ! جادو اثر کہانی ہے۔ اپنی ڈائری لکھنا بڑا نازک کام ہے۔ ایک طرف یہ خطرہ کہ اپنی ذات کو اپنے قلم سے شاندار بنا کر نہ دکھایا جائے اور دوسری طرف یہ ڈر کہ کہیں انکسار اس حد تک نہ ہو کہ ہیچمدانی کے ساتھ ناکارگی پیدا کرنے کا باعث بنے۔ حکیم صاحب اس پلِ صراط سے کامیاب گزرے ہیں۔

دل تو یہ چاہتا ہے کہ حکیم صاحب کے روزمرہ پروگراموں اور معمولات کو' ان کے سفروں کے احوال کو' ان کے بیت الحکمتہ اور شعبہ مطبوعات کو' مریضوں کی چارہ گری کی دل پسند

خدمت کو' ان کی خاص خاص مجالس میں شرکت اور خاص خاص شخصیتوں سے ربط کو' ان کی سفید لباسی اور کم خوری اور بکثرت روزہ داری کو اور اچھے اور برے احوال و معاملات اور اچھی اور بری ملاقاتوں پر پیدا ہونے والے تاثرات کو' خصوصاً" ان کی پابندی وقت کو (جس نے ایک موقع پر مجھ جیسے پابند وقت کو بھی پچھاڑ دیا) ---- پھر ان کی اسکیموں اور منصوبوں کو دل کھول کر بیان کروں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی بچی کہانی کے ذریعے وہ بیش بہا قدریں بچوں کے دل و دماغ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے جو ان کا خاندانی خزانہ ہے اور اس خزانے میں محبتِ خدا اور محبتِ انسانیت کے لعل و جواہر جمع ہیں۔

مجملاً" میں صرف ایک بات کہوں گا کہ جن والدین یا اساتذہ کو یہ سیکھنا ہو کہ بچوں کی تربیت صحیح خطوط پر کرنے کا نہایت اچھا اسلوب کیا ہے وہ اس "بچی کہانی" کو پڑھ کر ہر صفحے سے یہ سبق لیں کہ حکیم صاحب نے خیر و خوبی کا جوہر نونہالوں میں پیدا کرنے کے لیے کس کس انداز سے کام لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر اردو زبان میں یہ بہترین کتاب ہے۔ اور ۸' ۱۰ سال یا اوپر کے بچوں کے لیے یہ دلچسپ کہانی بھی ہے اور کہانی کہانی میں یہ کہانی کتنی اہم حقیقتیں ان کو پیارے انداز سے سکھا جاتی ہے ۔ یہی حقیقتیں عام ناصحانہ طرز یا مروجہ تدریسی طریقِ کار سے بیان کی جائیں تو بچوں کو بھاری چٹانیں لگیں اور وہ ان سے دور بھاگ جائیں۔ حکیم صاحب نے چٹانوں کو اپنے طریق ابلاغ سے پھول بنا دیا ہے۔

جنوری' فروری' مارچ ۱۹۹۲ء کے تین حصے موصول ہونے کے بعد قدرتی طور پر اگلے تین حصوں کا بھی ہمیں نونہالوں کے سے اشتیاق سے انتظار ہے۔

ایک جگہ حکیم صاحب یہ لکھ گئے ہیں کہ نماز مسجد ہی میں پڑھتا ہوں' مگر آج گھر ہی پر پڑھ لیتا ہوں (الفاظ نہیں' صرف مفہوم !) یہ بات کسی تلقینی گفتگو یا تذکرے میں بچوں تک منتقل نہیں ہونی چاہیے۔ ایک جگہ لکھا ہے (ڈائری مارچ ص ۳۹) ---- ایک چھوٹی میز پر درجنوں تسبیحاں ہیں۔ تسبیحاں کو کسی نہ کسی طرح فارسی سانچے میں ڈھال کر تسبیح کا جمع قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر اردو میں یہ جمع نامونوس لگتی ہے۔ سیدھی طرح تسبیحیں کہا جاسکتا ہے۔

مدعا نکتہ چینی نہیں۔ ایسی باتیں اچھے اچھے عالموں اور ادیبوں کی نگارشات میں بھی رہ جاتی ہیں۔

آخر بچارے تبصرہ نگار کو کچھ تو اپنی کرامات دکھانی چاہئیں۔

(ن ۔ ص)

اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ : از محترمہ ثریا بتول علوی' ایم اے اسلامیات (گولڈ میڈلسٹ)۔ صفحات ۲۵۶' قیمت ۵۲ روپے۔ ناشر: شفیق الاسلام فاروقی۔ ملنے کا پتہ : حرا پبلی کیشنز' ۲/۱۴ فضل الٰہی مارکیٹ' اردو بازار' لاہور۔

نہایت ہی نمایاں موضوع' کیونکہ اس پر ہر خیال کے لکھنے بولنے والے کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہیں' اور نہایت ہی اہم موضوع کہ ابھی تک کما حقہ' اس کا تجزیہ اور متعلقہ مسائل کا اطمینان بخش حل ہو نہیں سکا۔

علامہ اقبالؒ نے مسئلہ زن کے متعلق سخت معذوری کا اظہار کیا تھا۔

اس بحث کا میں فیصلہ کچھ کر نہیں سکتا
مجبور ہیں ناچار ہیں مردان خردمند

پھر انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس مسئلے کو عورت ہی فاش کرے۔ غالباً" مقصد یہ کہ مرد جب بات کرتا ہے تو اسے قضیے کا فریقِ غالب گردانا جاتا ہے جو اپنی برتری کے لیے بحث و استدلال کرتا ہے۔

مغربی تہذیب نے صورتِ مسئلہ ہی بگاڑ دی ہے' کیونکہ اس نے مرد اور عورت کو دو حریف اور متقابل قوتیں بنا دیا ہے۔ اسلام کو بطور صراطِ مستقیم تسلیم کرنے والوں کے لیے ہماری فاضل بہن ثریا بتول علوی نے بڑا صحیح نہج اختیار کیا ہے۔ انہوں نے مرد اور عورت دونوں کو متخالف اصناف قرار دینے کے بجائے دونوں کو مساویانہ طور پر اسلام کی عدالت میں کھڑا کر دیا ہے۔ خدا و رسولؐ نے جو حقوق و فرائض مرد کو دیے ہیں وہ ان کو سنبھالے اور پابندی کرے اور عورت کو جو حقوق و فرائض دیے ہیں وہ انہیں سمیٹے اور ان پر مضبوط قدم جمائے۔ مقررہ حدود سے نہ ایک فریق آگے یا پیچھے جائے اور نہ دوسرا۔ ثالثی کی یہ اعلیٰ ترین صورت ہے جو مسلمان مردوں اور عورتوں کی تمام نزاعات کو ختم کرنے والی ہے۔ کیونکہ جب خدا و رسولؐ کی عدالت فیصلہ دے دے تو پھر اہلِ اسلام کی نزاعاتِ حقوق و فرائض تو ختم ہو جاتی ہیں۔

کتاب کی مصنفہ ایک ایسی خاتون ہیں جو دینی اور دنیوی تعلیم کے لحاظ سے مقام اعتبار رکھتی ہیں' ایمان اور اسلامی کردار سے آراستہ ہیں' احکام حق کی پابند ہیں۔ وہ نہ مسائل کے فہم میں کوتاہی رکھتی ہیں' نہ جانب داری!

اس کتاب میں عورت کو اس کی تمام حیثیتوں کے ساتھ قرآن و حدیث اور عقل کے رو

سے عز و شرف کے مقام پر دکھایا گیا ہے اور ہر دائرے میں اس کے حقوق و فرائض واضح کیے گئے ہیں۔ ان جامع بحثوں میں شریعت کے بہت سے احکام و مسائل سامنے آگئے ہیں۔ آج کل کی بحثوں کے لحاظ سے چند موضوعات بڑے اہم ہیں۔ مثلاً "اسلام نے عورت کو کیا دیا" "عورت بہ حیثیت انسان" "ممتاز کون ہے ؟" "گھریلو نظم میں عورت کے حقوق اور اختیارات" "جدید تعلیم یافتہ ملازم مائیں" باہر نکلنے کے لیے حدود" "معاشی محاذ" "مغربی خواتین کا تلخ تجربہ" "دائرہ کار میں اسلام کی تقسیم حرفِ آخر ہے" "موجودہ تعلیمِ نسواں کے نقصانات" "مخلوط تعلیم" "تعلیم یافتہ عورت خود سر ہوتی ہے" (اور تعلقات میں تصادم پیدا کرتی ہے)' "مغربی مفکرین کی شہادت" "نسوانی تقدس کا جنازہ" اور "خاندانی منصوبہ بندی اور اسلام"۔ ۵ ابواب کے تحت ذیلی عنوانات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

مصنفہ کا لکھا ہوا دیباچہ "میرے پیارے اسلام" بہت ہی خوب ہے۔ اور پیش لفظ اس شخص کا لکھا ہوا ہے جو دوسرے کارناموں کے علاوہ صحابیات کی بہت زیادہ تعداد کے تذکرے کا سب سے بڑا مجموعہ پیش کرچکا ہے اور باکمال خواتین پر بھی ایک شاندار کتاب لکھ چکا ہے' یعنی طالب ہاشمی۔ اس پیش لفظ میں بھی اصل موضوع سے متعلق بہت مفید نکات شامل ہیں۔

(ن - ص)

اراکانی مسلمانوں کی جدّوجہدِ آزادی : مصنف : محمد الیاس انصاری۔ ضخامت : ۱۶۷ صفحات ' قیمت : چالیس روپے۔ناشر: حرا پبلی کیشنز اردو بازار لاہور۔

مسلمانوں نے اپنی چودہ سو سالہ تاریخ میں ' بحیثیت مجموعی غیرمسلموں سے ہمیشہ روا دارانہ' بلکہ برادرانہ حد تک ہمدردی و حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا' مگر تاریخ کا یہ عبرت انگیز منظر ہمارے سامنے ہے کہ بیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں مسلمانوں' خصوصاً مسلم اقلیتوں کو انہی غیرمسلموں کے جنونی متعصبین کی انتقامی کارروائیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ عیسائیوں ' یہودیوں اور ہندوؤں کے ساتھ اب برما کے بُدھ بھی مسلم کشی کی اس مہم میں شریک ہوگئے ہیں۔ برما کے صوبہ اراکان میں ' جہاں اڑھائی سو سال پہلے ایک آزاد مسلم ریاست قائم تھی' مسلمانوں کے لیے جینا دوبھر ہو رہا ہے۔ مسئلے کی پوری تفصیل اور تصویر محمد الیاس انصاری نے' زیرِ نظر کتاب کے ذریعے' پیش کی ہے۔

وہ کون سا ظلم ہے جو اراکانی مسلمانوں پر روا نہیں رکھا گیا --- آبادیوں کی بربادی' قتل ' آتش زنی' آبروریزی' زمینوں اور جائیدادوں کی ضبطی' ملازمتوں سے برطرفی' مکاتب و مدارس کی

بندش، نظربندی اور بالآخر جبری بے دخلی اور ہجرت ---

محمد الیاس انصاری نے نہایت محنت اور کاوش سے اس افسوس ناک داستان کا تاریخ وار منظرنامہ مرتب کیا ہے۔ جس میں مسلمان ممالک، انسانی حقوق کی علمبردار تنظیمیں، قوموں کے لیے حقِ آزادی کی چیمپئن بڑی طاقتیں اور خود اقوامِ متحدہ اپنے کردار کا مشاہدہ کرسکتی ہے --- انصاری صاحب کی محنت قابلِ داد ہے --- یہ کاوش، اگر بے حسی کی برف کو پگھلا سکے تو ان کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔ برمی مسلمانوں کے مسئلے کے پیش منظر و پس منظر سے آگاہی کے لیے یہ ایک مفید اور مؤثر کتاب ہے۔

(ر - و - ہ)

وحدتِ اُمّت : از مولینا محمد اسحاق صاحب خطیب جامع مسجد محمدی کریمیہ، فیصل آباد۔ ناشر: مکتبہ ملیہ، مکان نمبر ۸۱ گلی نمبر ۸، گلگشت کالونی، فیصل آباد۔

اہلِ قبلہ کی تکفیر اور فقہی اختلافات کی بنا پر ملت میں محاذ آرائی کے خلاف ایک مدلّل مقالہ بہ شکل پمفلٹ۔

(ن - ص)

REGD. NO. L 5340

PHONE : 234014
236665

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE